

ماہنامہ

ہمدرد نونہال

اگست ۲۰۱۷ء

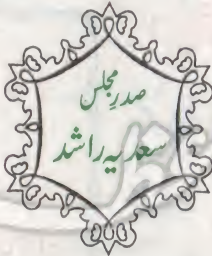
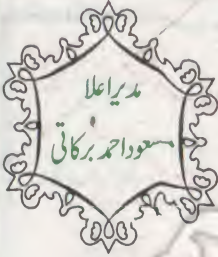
PP
PAKISTANI
POINT



پاکستانی پوائنٹ

اشاعت کا ۶۵ واں سال

یادگار : شہید پاکستان حکیم محمد سعید



رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

اگست ۲۰۱۷ عیسوی

جلد ۶۵

شمارہ ۸

زیقعد ۱۴۳۸ ہجری

قیمت عام شمارہ
۳۵ روپے

سالانہ (عام ڈاک سے)
۳۸۰ روپے

سالانہ (رجسٹر سے)
۵۰۰ روپے

سالانہ (دفتر سے دستی پیکر)
۳۲۰ روپے

سالانہ (غیر نمائندگی سے)
۵۰ امریکی ڈالر

36620949 سے 36620945

36616004 سے 36616001

(066 یا 052)

(92-021) 36611755

hfp@hamdardfoundation.org

www.hamdardfoundation.org

www.hamdard.com.pk

www.hakimsaid.info

www.facebook.com/Hamdardfoundationpakistan

میلے فون

ایم پی این

ایم ایس

ای میل

ویب سائٹ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان

ویب سائٹ ہمدرد لیٹرائز (وقف)

ویب سائٹ ادارہ سعید

فیس بک پیج

دفتر ہمدرد نو نہال ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

”ڈاک خانے کے نئے قاعدوں کی وجہ سے آئندہ ہمدرد نو نہال کی قیمت صرف

بک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں قابل قبول ہوگی، VPP بھیجنا ممکن نہیں ہے۔“

قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کا احترام ہم سب پر فرض ہے

سعیدہ راشد پبلشر نے اس پرنٹرز کراچی سے چھوڑا کہ ادارہ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی سے شائع کیا

ISSN 02 59-3734

اس شمارے میں کیا کیا ہے؟

جاگو گاؤ	۴	شہید حکیم محمد سعید
پہلی بات	۵	سلیم فرخی
روشن خیالات	۶	نخچہ گلچیں
نعت شریف	۷	ریاض حسین قمر
سنہرا بتل	۱۵	انیسہ محمود میر
پاکستان کا قومی ترانہ	۳۰	نسرین شاہین
خالی پنجرہ	۳۵	نذیر انبالوی
طاقت ور بے وقوف	۴۱	غلام یسین نوناری
آزادی (نظم)	۵۴	حکیم خاں حکیم
علم در پیچے	۵۵	نخچہ کندہاں
معلومات ہی معلومات	۵۹	غلام حسین میمن
نصیحت (نظم)	۶۲	کرشن پرویز
آپ کا جسم اور خلیے	۶۳

۸ جھنگ کی چڑیا

محمود شام

ایک چڑیا کی درد بھری کہانی جس کے ماں باپ کو مار دیا گیا تھا

۳۲ علم کی انتہا جہالت ہے

مسعود احمد برکاتی

علم اور جہالت میں کیا فرق ہے، ایک مثال دل چسپ کہانی کے انداز میں

۳۱ احسان مند

م۔ ص۔ ایمین

ایک مخفی غبارے والے کی کہانی جس کا حسن لاپتا ہو گیا تھا

۴۵ بڑا مجرم

غلام رسول زاہد

اصل مجرم کو پکڑنے کے لیے کیا طریقہ استعمال کیا گیا؟

۶۷ بلا عنوان انعامی کہانی

حسن ذکی کاظمی

اس مزے دار کہانی کا عنوان بتائیے اور ایک کتاب لپیچے

۹۲ اجنبی دوست

شاجین طارق

وہ لڑکا کون تھا جو طوفانی بارشوں میں لوگوں کی مدد کرتا تھا

یہ پاکستان ہے پیارے (نظم) ۶۴ سید سخاوت علی جوہر

نونہال خبر نامہ ۶۵ سلیم فرخی

ہنسی گھر ۸۱ نخچہ مزاح نگار

معلومات افزا-۲۶۰ ۸۴ سلیم فرخی

بیت بازی ۸۷ خوش ذوق نونہال

ہنڈ کلیا ۸۸ ذائقہ پسند نونہال

نونہال مصور ۸۹ نخچہ فن کار

الباطروس ۹۰ ظفر شمیم

مسکراتی لکیریں ۹۱ ادارہ

نونہال ادیب ۹۹ نخچہ لکھنے والے

آدھی ملاقات ۱۰۹ نونہال پڑھنے والے

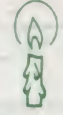
جوابات معلومات افزا-۲۵۸ ۱۱۳ ادارہ

انعامات بلا عنوان کہانی ۱۱۷ ادارہ

نونہال لغت ۱۲۰ ادارہ

نوناہوں کے دوست اور ہمدرد

شہید حکیم محمد سعید کی یاد رہنے والی باتیں



جاگو جگاؤ

انسان کو سب سے زیادہ جو چیز نقصان پہنچاتی ہے، وہ ہے لالچ۔ لالچ انسان کو خوش ہونے اور اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے نہیں دیتا۔ اس کو جو کچھ بھی میسر ہوتا ہے، وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ ہر وقت اسی فکر میں رہتا ہے کہ کچھ اور حاصل کرے۔ یہ فکر اس کو خوش ہونے نہیں دیتی۔ لالچی اور حریص آدمی ہمیشہ اس غم میں گھلا جاتا ہے کہ اسے یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا۔ فلاں کے پاس یہ ہے، میرے پاس یہ نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”بُری باتوں میں انسان کو سب سے زیادہ جلائے، کڑھانے والی بُرائی حرص ہے۔“

آج ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، ان پر غور کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہم اس عیب میں بُری طرح مبتلا ہیں۔ اس بُرائی نے ہماری زندگی سے سکون پھین لیا ہے۔ رشوت، چوری، ڈاکے، لوٹ مار، اغوا، یہ سب اسی لالچ کا نتیجہ ہے۔ لالچ میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر غلط کام کو اپنے لیے جائز سمجھنے لگتا ہے۔ قناعت کی خوبی اس سے چھن جاتی ہے۔ لالچی آدمی عقل سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ عقل مندی تو یہ ہے کہ آدمی کو جو کچھ بھی میسر ہے، اس سے خوش ہو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس کو کم از کم اتنا تو میسر ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں، جن کے پاس اتنا بھی نہیں ہے۔ لالچی آدمی کا ایمان بھی کم زور ہو جاتا ہے۔ اللہ کے پیارے رسولؐ کا یہ فرمان ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے: ”ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔“ حرص اصل میں ایک عذاب ہے۔ حریص آدمی کے کاموں سے دنیا تو پریشان ہوتی ہی ہے، وہ خود بھی آرام سے نہیں رہ پاتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں لالچ سے محفوظ رکھے۔

(ہمدرد نوناہ جولائی ۱۹۹۱ء سے لیا گیا)

پہلی بات

سلیم فرخی

اس مہینے کا خیال:

مثبت خیالات زندگی کو مایوسی اور

بددلی سے دور رکھتے ہیں۔

مسعود احمد برکاتی

ابھی خاص نمبر کی تحسین پوری طرح نہیں اُتری تھی کہ اگست کے شمارے کی مہم درپیش تھی۔ وقت کم تھا اور کام بے تحاشا۔ اللہ نے مدد کی، اس میں بھی سرخ زد ہوئے۔ آپ کے ہاتھ میں موجود اس شمارے میں بھی ان شاء اللہ آپ کو کوئی کمی محسوس نہ ہوگی۔ خاص نمبر کیسا لگا؟ اچھا یا بُرا جیسا بھی لگا ہو، ہمیں بتائیں، تاکہ آئندہ آپ سب کی پسند کو سامنے رکھا جائے اور کوئی کمی رہ گئی ہو تو اسے بُر کیا جاسکے۔

اسکول بھی کھل گئے ہیں۔ تین دہی اور یک سوئی سے علم حاصل کریں۔ بڑے اور نام ور لوگوں کی سوانح بھی پڑھیں۔ قائد اعظم نے بھی ملک حاصل کرنے سے پہلے علم حاصل کیا تھا۔ علم سے شعور پیدا ہوا۔ شعور نے جتو پر اُکسایا۔ مسلمانوں کی حالت سنوارنے کا خیال آیا تو اس کے لیے جدوجہد کی اور آخر مسلمان قوم کے لیے ایک علاحدہ وطن حاصل کر لیا۔ افسوس کہ وہ زیادہ دن ہمارے درمیان نہ رہ پائے۔ اس کے بعد ان کے مخلص ساتھی قائد ملت لیاقت علی خان بھی زیادہ عرصے ہماری رہنمائی نہ کر سکے۔

بہت سے نوناہ معلومات افزا کے سوالات مشکل ہونے کی شکایت کرتے ہیں، جب کہ بہت سے نوناہال مشکل سوالات سے خوش ہوتے ہیں۔ ایسے نوناہالوں میں جوش، جذبہ، جدوجہد اور مقابلے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ان میں سب سے آگے رہنے کی تمنا ہوتی ہے۔ آسان سوالوں سے انھیں مایوسی ہوتی ہے کہ یہ سب تو ہمیں پہلے ہی معلوم ہے۔ نوناہالوں کی مزید سہولت کے لیے اس بار ۱۶ کے بجائے ۱۲ سوالات پوچھے جارہے ہیں، تاکہ زیادہ سے زیادہ نوناہال حصہ لے سکیں۔ ہم ہر سوال کے تین اشارے بھی دیتے ہیں۔ آپ ایک سراغ رساں بن جائیے، جو اپنی حاضر دماغی کی بدولت ایک معمولی اشارے سے معاملے کی تک پہنچ جاتا ہے۔ جس طرح جسمانی صحت کے لیے جسمانی ورزش کی جاتی ہے، اسی طرح ذہنی صحت کے لیے ذہنی ورزش بھی کرنی چاہیے۔ معلومات افزا ایک طرح سے ذہنی ورزش ہے، اس سے بھی فائدہ اٹھائیے۔

نوناہال اپنے کو پن یا کوئی بھی تحریر بھیجنے کے لیے کم از کم کاپی ساز کا کاغذ استعمال کیا کریں اور دونوں کو پن الگ الگ کاغذ پر چسپاں کریں۔ ایک کو پن پر ایک ہی نام اور ایک ہی عنوان لکھا کریں۔

سونے سے لکھنے کے قابل زندگی آموز باتیں



روشن خیالات

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

دعا عبادت کا مغز ہے۔

مرسلہ : شازیہ ہاشم میواتی، قصور

حضرت ابوذر غفاریؓ

انسانوں سے محبت کرنا، دراصل اللہ سے محبت کرنا ہے۔

مرسلہ : عنایت اللہ، سکھر

بابا فرید شکر گنجؒ

ایمان کے بغیر عبادت فضول ہے اور عمل کے بغیر علم بے کار ہے۔ مرسلہ : ماہ نور طاہرہ ایف سی ایریا

شہید حکیم محمد سعید

ایک مومن جلال و جمال کا نہایت حسین امتزاج ہوا کرتا ہے۔ مرسلہ : محمد وقاص الحسن، جوہلی لکھا

عبدالستار ایدھی

انسانیت ایک بہت بڑا خزانہ ہے، اسے لباس میں نہیں، انسان میں تلاش کرو۔

مرسلہ : حافظ وقاص رؤف، صادق آباد

داصف علی داصف

دولت، رتبہ اور اختیار ملنے سے انسان بدلتا نہیں، بلکہ اس کا اصلی چہرہ سامنے آ جاتا ہے۔

مرسلہ : نور زہت، پنڈدادن خان

تاؤ

سب سے بہترین جنگجو وہ ہے جو کبھی غصہ نہ کرے۔

مرسلہ : ارسلان اللہ خان، حیدر آباد

کلیلیہ

دنیا کا کوئی شخص بے کار نہیں، ہر شخص سے کچھ نہ کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔

مرسلہ : عبدالرحمن بن عبدالرؤف قریشی، بلیر

جوزف اسٹالن

مصنف اپنی سوچ کا مصور ہوتا ہے۔

مرسلہ : پرویز حسین، کراچی

ہنری فورڈ

کام یا بی کاسب سے بڑا راز ہر صورت حال کے لیے تیار رہنا ہے۔ مرسلہ : تحریم محمد ابراہیم احمدانی، ساکنہ

نعت شریفؐ

ریاض حسین قمر

ان کو ہوئی ہے دولتِ ایمان کیا کہیے

غلامانِ محمدؐ مصطفیٰ کی شان کیا کہیے

کسی نے بھی نہ انسانوں میں ایسا مرتبہ پایا

سرِ عرشِ معلیٰ آپؐ ہیں مہمان کیا کہیے

خدا نے آپؐ کی توصیف کا ساماں کیا ایسے

اتارا آپؐ کی تعریف میں قرآن کیا کہیے

ترے دربار سے آقاؐ کوئی خالی نہیں جاتا

مجھے جاری تا قیامت آپؐ کا فیضان کیا کہیے

گہری تھی کفر کی تاریکیوں میں نورِ انسانی

خداے پاک کی سب کو ہوئی پہچان کیا کہیے

مرے آقاؐ شفیع المذنبین بن کو جو آئے ہیں

گناہ گاروں کی بخشش کا ہوا سامان کیا کہیے

کرم ہے آپؐ کا خدا کی مہربانی ہے

بنایا ہے قمر کو صاحبِ ایمان کیا کہیے

۷

ماہ نامہ ہمدردِ دنو نہال اگست ۲۰۱۷ء



۶

ماہ نامہ ہمدردِ دنو نہال اگست ۲۰۱۷ء



جھنگ کی چڑیا

محمود شام

یہ کہانی ہے، پاکستان کے ایک بہت پرانے شہر جھنگ کی۔

جھنگ کا نام لیں تو ہیرا بنجھا کی جوڑی یاد آتی ہے۔ ہیرا کی کہانی نامور شاعروں نے اورادیوں نے لکھی، لیکن مشہور ہوئی ہیرا وارث شاہ کی، جو پنجاب کے بہت سے شہروں اور دیہات میں چاندنی راتوں میں گائی جاتی ہے۔ گرمیاں ہوں تو کھلے آسمان تلے۔ ہاتھ میں پٹھے لیے۔ سردیاں ہوں تو الاؤ کے گرد۔ آپ پوچھو گے، الاؤ کیا ہوتا ہے۔ درمیان میں لکڑیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر جلا دی جاتی ہیں۔ ارد گرد لوگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ ویسے تو بہت سے خالی کھیس لپیٹ کر بیٹھے ہیں۔ کچھ گرم چادریں لے آتے ہیں، لیکن الاؤ کا تو اپنا ہی لطف ہے۔

ارے دیکھیں! ہم کہانی سناتے سناتے کہاں ہیرا بنجھے کی طرف نکل گئے۔ ان دونوں کا مزار بھی جھنگ میں ہے۔ اس مزار کی چھت نہیں ہے۔ سینکڑوں برس سے یہ روایت چلی آرہی ہے کہ بارش کتنے زور کی ہو، اس کے قطرے مزار پر نہیں گرتے۔

چلیں، اب آتے ہیں کہانی کی طرف۔

ایک گلی تھی۔ پکی اینٹوں کی بنی ہوئی۔ اس پر جب تانگے چلتے تھے تو گھوڑوں کی ناپوں کی آواز سن کر گھروں میں بیٹھے لوگ سمجھ جاتے تھے کہ کسی گھر میں کوئی مہمان آرہے ہیں۔ شادیوں کا موسم ہوتا تو سب جان لیتے کہ کسی دوسرے شہر سے کسی کے رشتے دار آئے ہیں، لیکن یہ تو کسی کے مرنے پر بھی ہوتا تھا۔ اس وقت انسان ان چیزوں کا بہت خیال رکھتے

تھے۔ غمی اور خوشی، آپس میں بانٹتے تھے۔

مگر ہماری کہانی غمی کی ہے نہ خوشی کی۔ یہ تو ایک چڑیا کی کہانی ہے۔

جس گلی کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس گلی میں ایک گھر تھا۔ دوسرے گھروں کے مقابلے میں اس کی انفرادیت اور پہچان یہ تھی کہ اس میں ایک بیری کا درخت تھا، جس کی شاخیں گھر سے باہر گلی میں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ جب بیری پک جاتے۔ گلی سے گزرتے بچے، جن میں اسکول آتے جاتے بچے بھی ہوتے تھے۔ وہ بچے بھی جنہیں ان کے ماں باپ اسکول نہیں بھیج سکتے تھے وہ بھی۔ آتے جاتے پھر مارتے، بیری گرتے تو اپنی جیب میں ڈال کر آگے بڑھ جاتے۔

بیری کی شاخوں پر چڑیاں تو اور بھی بیٹھتی تھیں۔ گھر کے لوگ بتاتے ہیں کہ چڑیوں کی چچہا ہٹ ان کو صبح صبح جگا بھی دیتی تھی۔ ان کی آوازیں کانوں کو بہت بھلی لگتی ہیں۔ گھر میں مرغیاں اور مرغ بھی تھے۔ مرغ صبح صبح اذان بھی دیتے تھے، لیکن ان کی آنکھ چڑیوں کی چچہا ہٹ سے ہی کھلتی ہے۔

ہم جس چڑیا کی بات کر رہے ہیں، اس کے پردوں کا رنگ دوسری چڑیوں سے ہٹ کر تھا۔ اس کی چچہا ہٹ بھی کچھ الگ تھی۔

آپ یہ جاننا چاہ رہے ہیں کہ گھر میں کون کون تھا۔

یہ بات بھی ہم چڑیا کی زبانی ہی سنتے ہیں۔

میں اس گھر سے بہت دور کہیں کھیتوں میں برگد کے ایک درخت پر رہتی تھی۔ میرے ابا، اماں بھی ادھر ہی تھے۔ یہاں کبھی گندم کی فصل پکتی، کبھی باجرے کی۔ بہت مزہ

آتا تھا۔ میری ماں کچھ دانا ڈنکا لے کر آتی، جو اپنی چوئچ سے میری چوئچ میں ڈالتی۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہتی کہ آرام سے کھاؤ۔ جلدی مت کرنا۔ دانے بہت ہیں۔ کھیت کا مالک احمد دین ہے۔ وہ ہمیں تنگ نہیں کرتا۔ تالیاں بجا کر اڑاتا نہیں ہے۔

میں کچھ بڑی ہوئی تو دور دور تک اڑ کر جاتی۔ ماں منع بھی کرتی کہ زیادہ دور نہیں جانا اور سورج کا رنگ جب زرد پڑنے لگے تو واپس اس پرانے برگد کے درخت پر آ جانا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ کھیت کے مالک کا بیٹا پڑھ لکھ کر دور کی بڑے شہر سے واپس آ گیا۔ ایک بڑی سی غلیل لے کر وہ ایک کھیت سے دوسرے کھیت جاتا۔ درختوں پر بیٹھے پرندوں کا نشانہ بناتا۔

ایک روز اس کے کئی دوست بھی آ گئے اور ان کی آپس میں یہ شرط لگ گئی کہ اس چڑیا کو نشانہ بنانا ہے۔ ان کا اشارہ میری ماں کی طرف تھا۔

میرے والد بھی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میری ماں سے کہا کہ وہ بڑے پتوں کے پیچھے چھپ جائے۔ اتنی دیر میں کھیت کے مالک کے بیٹے کے ایک دوست نے میرے والد کو دیکھ لیا۔ ارے! میں کھیت کے مالک کے بیٹے کا نام تو بتانا بھول گئی۔ اس کے بیٹے کا نام ارسلان تھا۔ اس کے دوست کا نام تھا پرویز۔ یہ گوجرانوالہ سے آیا تھا۔ ارسلان اور پرویز لاہور میں کسی کالج میں اکٹھا پڑھتے تھے۔ ہمارے دادا، دادی ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ گوجرانوالہ کے نوجوانوں سے بچ کر رہنا۔ ان کو چڑے کھانے کا شوق ہوتا ہے۔ میں تو سہم گئی تھی۔ یہ برگد کا بیڑ بہت پرانا تھا۔ میرے ماں باپ نے اس پر بہت خوب صورت اور آرام دہ گھونسلے بنائے ہوئے تھے، لیکن جب آخری وقت آتا ہے تو گھونسلے کتنے آرام دہ

ہوں، خوب صورت ہوں۔ کام نہیں آتے۔ ہوا یہی کہ میں تو ڈر کر گھونسلے کے اندر جا کر بیٹھ گئی۔ اس میں ہم نے ایک کھڑکی بنا رکھی تھی۔ اس میں سے ہم جھانک کر دیکھتے رہتے تھے کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ بلیوں سے ہمیں خبردار رہنا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی چیلوں سے بھی۔ کوئے زیادہ تنگ تو نہیں کرتے، لیکن بعض اوقات ان کا بھی چھیڑ چھاڑ کا موڈ ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی بُرا دن تھا۔

ارسلان اور پرویز کے ارادے بہت خطرناک تھے۔ کھیت کا مالک احمد دین گندم کی بوریاں لے کر شہر کی غلہ منڈی میں پہنچانے گیا ہوا تھا۔ زمیندارنی حویلی میں آرام کر رہی تھی۔ وہ آرام کے علاوہ کچھ نہیں کرتی تھی۔ ضرورت بھی کیا تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ بیٹا پڑھ لکھ گیا۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھر کی ہو گئی تھیں۔ نوکر چاکر بھی تھے۔

وہ بہت ہی بھیاںک منظر تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ارسلان نے غلیل کی ربڑ کھینچنا شروع کی۔ پرویز نے بھی۔ میں چلائی۔ ابا، امی دونوں کو خبردار کرنے کی کوشش کی۔ ادھر میں چیخی، ادھر غلیلوں نے پتھر داغ دیے۔

میں یہ دن کیسے بھولوں گی۔ میرے دیکھتے دیکھتے ابو میری امی دونوں شاخ سے لڑھک گئے۔

ارسلان اور پرویز دامن پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ ابو پرویز کی جھولی میں، اماں ارسلان کی۔ دونوں نے غلیلیں نیچے پھینک دی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ دونوں نے جیب سے چاقو نکالے اور میرے ابو، امی کے گلوں پر پھیر دیے۔ سنا ہے کہ مسلمان چاقو چلانے سے پہلے اللہ اکبر پڑھتے ہیں اور بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت اذان کی آواز بھی بلند ہوئی۔ وہ دونوں یعنی ارسلان اور پرویز ہنستے مسکراتے چل دیے۔

اب وہ گھونسل، میرا آبائی گھر مجھے پیجرہ یعنی قید خانہ لگنے لگا۔ میرا دل کہنے لگا کہ اب یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں رہی۔ دوسری چڑیوں نے مجھے بہت سمجھایا کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ یہ شہروں میں پڑھ کر آنے والے نوجوان اپنے بزرگوں کی طرح سمجھ دار اور رحم دل نہیں ہوتے، لیکن ہم تو برسوں سے یہاں رہتے آرہے ہیں۔ کھانے کو بہت دانے مل جاتے ہیں۔ آزادی بھی ہے، مگر میرا دل نہیں مانا۔ میں وہاں سے اڑی اور سوچا کہ سورج جہاں بھی ڈوبنے والا ہوگا، میں وہاں آس پاس کوئی پیڑ دیکھ کر ٹھکانا بنا لوں گی۔ میں وہاں سے نکلی تو ایک تو تا بھی اسی رخ پر جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کہاں جانا ہے؟

میں نے کہا کہ میں تو اس گاؤں سے کہیں دور جانا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی دکھ بھری کہانی بھی سنا دی۔ سن کر توتے کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہوا بھی اُداس ہو گئی۔ توتے نے کہا، میرے ساتھ چلو۔ ایک گھر میں میری کا درخت ہے۔ میں وہیں رہتا ہوں۔ دن بھر ادھر ادھر اڑ کر کچھ دانے جمع کر لیتا ہوں، وہاں سکون سے بیٹھ کر کھا لیتا ہوں۔

”وہاں غلیل والے تو نہیں آتے؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

نہیں، کبھی نہیں، بلکہ یہ گھر والے تو اتنے مہربان ہیں کہ ہمارے لیے ایک برتن میں ہر صبح پینے کے لیے پانی رکھ دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی کچھ جوار اور باجرہ!

”تم پھر ادھر ادھر کیوں اڑتے ہو؟“ میں نے اس کی طرف منہ موڑ کر سوال کیا۔

”بات یہ ہے کہ ان دونوں برتنوں پر چڑیوں کے جھمگٹے لگے رہتے ہیں۔ میں ان کو تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ پھر اللہ نے پردیے ہیں۔ کھلی فضا میں ہیں، بہت مزہ آتا ہے۔“ وہ میری طرف دیکھے بغیر جواب دے رہا تھا۔

کھیت ختم ہو رہے تھے، گھروں کی چھتیں دکھائی دینے لگیں۔ انسان گلیوں میں بڑی تعداد میں گھوم رہے تھے۔

تو تا مجھے اس گھر میں لے آیا۔ یہاں میری چڑیا بہنیں اور چڑے بھائی بہت خوش ہوئے۔ میرے پروں کا رنگ دیکھ کر وہ ذرا گھبرائے تھے، لیکن جب دو تین دن میں ان کے ساتھ اٹھی بیٹھی تو وہ مجھے اپنا جاننے لگے۔

آپ نے پوچھا تھا، اس گھر میں کون کون تھا۔

معاف کیجیے، میں اپنی کہانی میں کھو گئی۔ ایک تو تھے اس خاندان کے سربراہ، بڑے صاحب۔ ایک ان کی بیوی، انھیں سب بی بی کہتے تھے۔ ان دونوں کے بیٹے، بیٹیاں، سسر ہی بھلے لوگ ہیں۔

پرانی چیزیاں کہتی ہیں، اس گھر میں برتن بہت ہیں۔ آٹھ دس دن بعد برتن بدل دیے جاتے ہیں۔ دوسرے برتن اچھی طرح دھو کر لائے جاتے ہیں۔

ہمارے لیے پانی اور جوار باجرہ زیادہ تر بی بی رکھتی ہیں۔ کبھی کبھار وہ بڑی بیٹی سے کہہ دیتی ہیں تو وہ ہمارے ناشتے کا انتظام کر دیتی ہیں۔

ہم کبھی کبھی آنگن میں پھدکتے ہیں تو ان میں سے کوئی بھی برا نہیں مانتا۔ جی چاہتا ہے تو ہم ان کے کمروں میں بھی چکر لگاتے ہیں۔ ایسے ہی موڈ بنتا ہے کہ دیکھیں،

اندر کیا کیا رکھا ہوا ہے۔ کیسے بستر ہیں۔ کپڑے کہاں لٹکتے ہیں۔ کتابیں کہاں سجائی ہوئی ہیں۔ ساتھ ہی مسجد ہے، جہاں سے پانچ وقت اذان بلند ہوتی ہے تو بڑے صاحب اور ان کے بیٹے نماز کے لیے چلے جاتے ہیں۔ بی بی بھی وضو کر کے جانماز بچھا کر نماز پڑھنے لگتی ہیں۔ میں پہلے تو دور دور سے دیکھتی تھی۔ اب میں قریب جا کر گھاس پر بیٹھ جاتی ہوں۔ یہ میرے خیال میں ظہر کی نماز کہلاتی ہے۔ اس کے بعد وہ قرآن پاک رحل میں رکھ کر پڑھتی ہیں آہستہ آہستہ۔ مجھے یہ آواز بہت ہی اچھی لگتی ہے۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔ یہ میری کا درخت بہت پرسکون ہے۔ گرمیوں میں یہ سوئدیاں بہت تنگ کرتی ہیں۔ ہمیں بھی اور گھر والوں کو بھی۔ جب ہم ان سوئدیوں کو چونچ سے ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہیں، تو گھر والے بہت خوش ہوتے ہیں۔

آپ سن بھی رہے ہیں یا سو گئے ہیں۔

☆

لکھنے والے نونہالوں کو مشورہ

نونہال کہانی، مضمون وغیرہ جب اشاعت کے لیے بھیجیں تو ایک نقل (فوٹو کاپی) اپنے پاس ضرور رکھا کریں۔ جب آپ کی بھیجی ہوئی تحریر شائع ہو جائے تو دونوں کو ملا کر دیکھیں کہ کہاں کہاں تبدیلی کی گئی ہے۔ کس جملے کو کس طرح درست کیا گیا ہے۔ کون سا بیرونی اگر اف کاٹا گیا ہے اور نیا بیرونی کہاں سے شروع کیا گیا ہے۔ تحریر کا عنوان بدلا گیا ہے یا نہیں اور اگر بدلا گیا ہے تو کیا یہ پوری تحریر کا احاطہ کر رہا ہے یا نہیں۔ ایسا کرنے سے آپ بہت جلد اچھا لکھنے لگیں گے۔ تحریر لکھ کر اس کے نیچے اپنا پتا ضرور لکھ دیں، ورنہ تحریر ضائع ہو جائے گی۔ طویل تحریر نہ لکھیں۔

☆

سنہرا تیل

انیسہ محمود میر

انھوں نے اچانک گاڑی کو بریک لگائے، لیکن سامنے آنے والا نوجوان گاڑی سے ٹکرا گیا، حنان راشد نے دیکھا، وہ ایک بہت خوش شکل لڑکا تھا۔ وہ اسے فوراً قریبی اسپتال لے گئے۔ وہاں انھیں پتا چلا کہ لڑکے کا خون بہت بہ چکا ہے اور فوری طور پر خون کی ضرورت ہے۔ اسپتال میں اس گروپ کا خون میسر نہیں تھا۔ انھوں نے اپنا خون چیک کروایا تو بالکل وہی گروپ تھا۔ خون کی ایک بوتل دے کر وہ پرسکون ہو گئے، کیوں کہ اب لڑکے کی حالت خطرے سے باہر تھی۔

حنان راشد کا شمار شہر کے دولت مند لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کے پاس دنیا کی ہر نعمت تھی۔ انھیں صرف ایک بیٹے کی آرزو تھی۔ ان کی اتنی بڑی جائیداد کا وارث کوئی نہیں تھا۔ یہ سوچ سوچ کر وہ اکثر پریشان رہتے تھے۔

دوسرے دن لڑکے کو ہوش آ گیا تو حنان راشد اس سے ملنے گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی ان کی نظر سیدھی بیڈ پر پڑی، جہاں وہ پندرہ سولہ سال کا خوش شکل لڑکا آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ اس کا ماتھا اور بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ انھیں افسوس ہوا کہ ان کی وجہ سے اس معصوم لڑکے کی یہ حالت ہو گئی، لڑکے نے آنکھیں کھولیں اور انھیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

”السلام علیکم!“ حنان کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”وعلیکم السلام!“ وہ انھیں غور سے دیکھنے لگا۔

”کیسی طبیعت ہے بیٹے! اب تمھاری؟“

”جی، پہلے سے بہتر ہے۔“

”گڈ! تمھیں کچھ یاد ہے اپنے بارے میں؟“ وہ اس سے نہایت شفقت سے بات



ایک دن اس کے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی۔ وہ اسپتال سے پٹی کروا کے واپس آ ہی رہا تھا کہ اسے اسپتال کی کھڑکی میں ایک بچہ دکھائی دیا، اس نے دیکھا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے اور کھڑکی کے ساتھ ہی پڑے بیڈ پر بہت خوب صورت بچہ لیٹا ہوا ہے اور وہ زار و قطار رو رہا ہے۔ وہ فوراً ڈاکٹر کو بتانے کے لیے مڑا، لیکن اسی وقت شیطان نے اسے بہکا دیا۔ اس نے موقع دیکھ کر بچے کو اٹھایا اور نہایت احتیاط سے اسے گھر لے آیا۔

رحمان نے اس بچے کا نام سعد رکھا۔

بچے کے غائب ہونے سے ڈاکٹر اور نرسیں کمرے میں پریشان بیٹھے تھے: ”اوہو! ہم انھیں کیسے بتائیں گے کہ ان کا بچہ اغوا ہو گیا ہے، وہ ہمیں مصیبت میں ڈال سکتے ہیں۔“ ایک نرس کی آواز آئی۔

ڈاکٹر نے کہا: ”نہیں، وہ نہایت سمجھ دار انسان ہیں۔ وہ صرف اغوا کی رپورٹ

کر رہے تھے۔

”جی..... اچھی طرح۔“ وہ ماضی میں کھو گیا۔

”خوب! تمہارا نام کیا ہے؟“ انھیں دلی خوشی ہوئی کہ لڑکے کی یادداشت کو کوئی

نقصان نہیں پہنچا۔

”میرا نام سعد ہے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”کیا واقعی..... میری بھی خواہش تھی کہ میں اپنے بیٹے کا نام سعد رکھوں گا۔ میرا بیٹا

پیدائش کے فوراً بعد ہی اغوا ہو گیا تھا، لیکن..... خیر، تمہارے والد کا نام کیا ہے؟“

”انکل! چکر آ رہے ہیں۔“ اسے سب کچھ گھومتا ہوا نظر آیا۔ حنان ارشد نے فوراً ڈاکٹر کو بلا لیا۔

ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگا دیا اور وہ نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

”ڈاکٹر! کیا ہوا؟ یہ ٹھیک تو نہ تھا؟“ وہ پریشان ہو گئے تھے۔

”جی بالکل! آپ فکر مت کریں، بس بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا ان کا۔ آپ آئیں، میں

آپ کو کچھ دواؤں لکھ دیتا ہوں۔“ حنان ارشد ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکل گئے، لیکن اپنا کارڈ

وہیں سائنڈ ٹیبل پر رکھ آئے تھے کہ ممکن ہے، وہ انھیں فون کرنا چاہے۔

☆.....☆.....

رحمان کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اس کا سارا خاندان قیام پاکستان کے دوران

شہید ہو گیا تھا۔ تب وہ ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ اسے ایک آدمی نے پالا تھا، اکیلا رہتا تھا۔ وہ

دونوں اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ اس مہربان آدمی کا انتقال ہو گیا۔ رحمان بہت

غم زدہ ہوا، پھر اس نے سائیکلوں کی دکان کھول لی۔ آہستہ آہستہ ”رحمان سائیکل“ کے

نام سے اس کی دکان ترقی کرتی گئی۔



کانام اور پوری تفصیل پڑھی تو پتا چلا کہ میں تو سعد حنان ہوں۔ ڈائری میں اخبار کا ایک تراشہ بھی تھا، جس میں انگو کی خبر کے ساتھ آپ کا نام لکھا تھا۔ آپ کی تلاش میں، میں گھر چھوڑ کر نکلا تو قدرت نے آپ ہی کی گاڑی سے ٹکرا دیا۔ پاپا! اگر یقین نہ آئے تو بے شک آپ اس آدمی سے پوچھ لیجیے گا، جس نے مجھے پالا ہے۔“ وہ آنسوؤں کی جھڑی میں سب بتا رہا تھا۔

حنان راشد نے سکتے کہ عالم میں اس کا ہاتھ پکڑا تو چونک اٹھے: ”نہیں بیٹا! اب یقین نہ ہونے کی گنجائش نہیں ہے، کیوں کہ تمہارے ہاتھ کی پشت پر وہی سنہرا تیل ہے جو میرے ہاتھ میں بھی ہے۔“ انھوں نے اپنے ہاتھ کو سعد کے ہاتھ کی پشت پر رکھتے ہوئے کہا: ”آج میں تمہاری امی کو بیٹے کا اور تمہاری بہن کو بھائی کا تحفہ دوں گا۔“

☆ اگلے ہی لمحے وہ دونوں خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے لپٹ گئے۔

درج کرائیں گے۔ ہم سے غفلت ضرور ہوئی ہے، اُمید ہے، وہ درگزر کر دیں گے۔“

دن، مہینے اور مہینے، برسوں میں بدلتے گئے۔ سعد رحمان اب پندرہ سال کا ہو گیا تھا۔ ایک دن رحمان کسی کام سے کہیں دور گیا ہوا تھا۔ سعد بور ہو رہا تھا۔ بہت دن پہلے وہ کسی رسالے میں بہت اچھی کہانی پڑھ رہا تھا، لیکن کسی وجہ سے وہ نامکمل رہ گئی تھی۔ آج اچانک اسے وہ کہانی یاد آئی تو الماری میں وہی رسالہ تلاش کرنے لگا۔ رسالہ تو نہیں ملا، البتہ ایک پرانی ڈائری اسے نظر آئی۔

سعد اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ وہ ڈائری رحمان کی تھی۔ سعد جیسے جیسے پڑھ رہا تھا، اس کا وجود لرز رہا تھا، پھر اس کے ہاتھ سے ڈائری چھوٹ گئی۔ وہ چپ چاپ باہر نکل گیا۔ روڈ پر بے دھیانی سے چلتے ہوئے اسے ایک تیز رفتار گاڑی اپنی طرف آتی دکھائی دی اور دوسرے لمحے اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆.....☆.....

سعد نیند سے جاگا تو ڈاکٹر کو اپنے پاس کھڑے پایا۔ ڈاکٹر نے اس کا بلڈ پریشر چیک کیا اور پھر واپس چلا گیا۔ سعد اٹھ کر بیٹھ گیا، پھر اس کی نظر میز پر پڑے کارڈ پر جاٹھیری۔

”اوہ! لگتا ہے، انکل اپنا کارڈ یہیں بھول گئے۔“ اس کے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی اس نے کارڈ اٹھالیا اور کارڈ پر لکھے ہوئے نام کو پڑھ کر وہ سکتے میں آ گیا۔

حنان راشد اپنی کچھ مصروفیات کے باعث اسپتال نہیں آ سکے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے ڈسچارج کر دیا تو وہ اسے لینے آئے۔ سعد کمرے سے باہر نکلتے ہی سامنے کھڑے حنان سے لپٹ گیا اور پاپا، پاپا کہتے ہوئے رونے لگا۔

حنان راشد نے حیرانی سے اسے دیکھا تو اس کے منہ سے آواز نکلی: ”پاپا! میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میں اپنی جڑواں بہن کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ مجھے رحمان نام کا آدمی اٹھا کر لے گیا تھا، پاپا اس طرح میں سعد رحمان بن گیا، لیکن ایک دن میں نے اس آدمی کی ڈائری میں آپ

احسان مند

م۔ ص ایمن



”یہ لو بیٹی! غبارہ لے لو۔“ بچی کو غبارہ دیتے ہوئے غبارے والے نے کہا۔
 ”نہیں بھائی! نہیں چاہیے۔“ بچی کی ماں نے جلدی سے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر
 اسے اپنے قریب کر لیا۔
 ”باجی! یہ غبارہ لے لیں، بچی مانگ رہی ہے۔“
 ”بچے ہر چیز مانگا کرتے ہیں۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنی بیٹی کو تیز چلنے کی تلقین کی
 اور واپسی کے لیے اپنی رفتار بڑھادی۔



مات بی اپنے خاندان کے دوسروں لوگوں سے آ کر مل گئے۔ یہاں بھی غبارے والا پیچھے پیچھے آ گیا۔

”باجی! لے لیں..... میری طرف سے لے لیں..... میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔“ کہتے ہوئے غبارے والے نے ایک غبارہ بچی کو پکڑا دیا۔ ایک دوسری بچی کو اور پھر اس کے خاندان کے ساتھ جتنے بچے تھے ان سب کو ایک ایک غبارہ تھپاتا گیا۔ ان بچوں کے ساتھ جو خواتین تھیں وہ حیران ہوتی رہیں۔

ایک بولی: ”یہ تم غبارے بیچنے آئے ہو یا بانٹنے؟“
 ”میں بیچنے ہی آیا ہوں۔ اگر بانٹنے ہوتے تو اپنے محلے میں ہی بانٹ دیتا، لیکن

آپ سے، آپ کے بچوں سے پیسے نہیں لوں گا۔“ غبارے والے کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اچانک ہی آنسو تیر گئے تھے۔ جانے کیسے آنسو تھے؟
خواتین جو ویسے ہی نرم دل ہوتی ہیں، اجنبی شخص کو آبدیدہ دیکھ کر بے حد متاثر ہو گئیں۔ غبارے والا آنکھیں پونچھتا ایک جانب چل دیا۔ خواتین حیران تو تھیں ہی، پریشان بھی ہو گئیں۔

شائستہ کے گھر مہمان آئے ہوئے تھے۔ ان سب کا پروگرام بن گیا کہ آج شہر کے بڑے پارک میں چلتے ہیں۔ سر شام ہی تمام افراد گھر سے نکل پڑے تھے۔ پارک میں داخل ہوئے ہی تھے کہ یہ غبارے والے یوں مل گیا جیسے ان کا پھٹرا ہوا رشتے دار ہو۔ ان کے ساتھ جتنے بچے تھے ان سب کو اس نے مفت میں غبارے دے دیے تھے۔ پہلے پہل تو انھیں خدشہ ہوا کہ کہیں ہمارے بچے کو بہلا پھسلا کر اغوانہ کر لے، لیکن اس کا جذباتی رد عمل دیکھ کر انھیں یہ خیال رد کرنا پڑ گیا۔

وہ سب پارک کا ایک گوشہ منتخب کر کے وہاں بیٹھ گئیں۔ کچھ بچوں کو پانی، کچھ کو جوس پلانے لگیں۔ کسی نے ساتھ لائے ہوئے نمکو وغیرہ نکال کر سب بچوں میں تقسیم کیے، تاکہ ان کا منہ چلتا رہے اور پارک سے کوئی چیز خریدنے کی ضد نہ کریں۔ ان کے ساتھ مختلف عمروں کے بچے تھے۔ شائستہ نے اپنے بڑے بیٹے کو بھیجا کہ جائے اور اس غبارے والے کو بلا لائے۔

لڑکا غبارے والے کو بلانے چلا گیا۔ لڑکے نے واپس آ کر جواب دیا: ”غبارے والے کہہ رہا ہے کہ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔“

اور واقعی وہ تھوڑی دیر میں آ گیا۔ اب کے اس کے ہاتھ میں غباروں کی چھڑی نہیں تھی، بلکہ ایک بڑی ٹرے تھی، جو اس نے دونوں ہاتھوں سے اٹھا رکھی تھی اور کسی مستعد بیرے کی طرح ان کی جانب چلا آ رہا تھا۔

اسے اپنی ہی جانب آتا دیکھ کر جملہ خواتین مزید حیران ہو گئیں کہ یہ کون ہے، کس کا جاننے والا ہے؟ پہلے ہمارے بچوں کو غبارے مفت میں دے گیا ہے اور اب ہمارے لیے یہ سب لا رہا ہے، جیسے کہ ہم اس کے مہمان ہوں۔

”باجی! یہ میں آپ کے لیے لایا ہوں۔ انکار نہ کیجیے گا، آپ میری بڑی بہن ہیں۔“ اس نے ٹرے ان کے پاس زمین پر رکھتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہا۔ اس کی مخاطب شائستہ ہی تھی۔ اس میں آکس کریم کے کون اور کپڑے تھے۔

”لیکن کیوں لائے ہو؟“

”آپ کو اپنی بڑی بہن سمجھ کر..... آپ میری بڑی بہن ہیں۔ مجھے اپنا بھائی سمجھ کر خدمت کا موقع دیں، آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوگی۔“ اس کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئی تھیں۔

شائستہ عجیب محضے میں پڑ گئی تھی وہ اکیلی ہوتی تو شاید زیادہ پریشان ہوتی، لیکن اس وقت تقریباً وہ سارے گھر والے ہی موجود تھے۔ شائستہ بولی: ”ٹھیک ہے میرے بھائی! میں تمہیں اپنا بھائی ہی سمجھتی ہوں، لیکن ہم اپنے بھائی کا نقصان نہیں چاہتے، یہ سب واپس لے جاؤ۔“ وہ ہنسی: ”ہم بہت ساری ہیں اور تمہارا بہت خرچا ہو جائے گا۔“

”نہیں باجی! آپ کی اور آپ کے ساتھ سب کی خدمت کر کے مجھے بہت خوشی

ہوگی۔ میں اس پارک میں کئی سال سے غبارے بچ رہا ہوں۔ آپ سب یہاں میرے مہمان ہیں۔ یہاں آپ کے بچے جو بھی جھولا جھولیں گے، اس کی ادائیگی میں کروں گا، آپ ایک پیسہ بھی خرچ نہ کریں۔“

”لیکن کیوں.....؟“

”میں نے کہا نا، آپ میری بہن ہیں۔ آپ کے بچے میرے بھانجے بھانجیاں ہیں۔ مجھے اپنی خدمت سے محروم نہ کیجیے گا۔“

شائستہ اسے جواب دینے کے لیے الفاظ کا چناؤ کر رہی رہی تھی کہ وہ بولا: ”میری کوئی بہن نہیں ہے۔ مجھے ماموں کہنے والا کوئی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب کو اپنے گھر لے جاؤں۔ آپ کے بچے مجھے ماموں کہیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“ اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ سارے جہاں کا درد اس کے چہرے میں سمٹ آیا۔

ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بات یہیں ختم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ تو ان سب کو اپنے گھر لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

شائستہ بولی: ”لیکن کیوں.....؟ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو، پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم ہمارے

بھائی کیسے ہو گئے؟ تم ہمیں کیسے جانتے ہو، جب کہ ہم تمہیں بالکل بھی نہیں جانتے۔“

”میں بتاتا ہوں باجی!“ اس نے کہا اور فوراً ہی اس کی پلکوں میں نمی تیر گئی: ”میں یہاں بیٹھ جاؤں؟“ اس نے عاجزی سے اس کے سامنے زمین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اجازت چاہی۔

شائستہ نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

جولڑکا اسے بلانے گیا تھا، اسے اس نے قریب بلایا اور شائستہ سے پوچھا: ”یہ

آپ کا بیٹا ہے؟“

”ہاں۔“ شائستہ نے کہا۔

”کیا نام ہے بیٹے آپ کا؟“ اس نے پوچھا تو بیٹے نے اپنی ماں کی طرف دیکھا کہ اس اجنبی کو اپنا نام بتانا مناسب بھی ہے یا نہیں؟ شائستہ نے اپنے بیٹے کا نام اسے بتایا تو اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے دیا اور بولا: ”جبران بیٹا! ان سب بچوں کو لے جاؤ، جس جھولے پر جھولنا چاہو، کوئی چیز کھانا چاہو تو کسی کو پیسے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کارڈ دکھا کر کہنا، ہمیں منظور ماموں نے بھیجا ہے۔“

پھر شائستہ سے بولا: ”یہاں کے سارے اسٹال والے، انتظامیہ سے میری واقفیت ہے۔ آپ کو یہاں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنے دوں گا۔ کوئی جھولا جھولیں، کوئی چیز کھانے کو بھی چاہے۔ سب میری طرف سے۔“

”یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم ہمارے بھائی کیسے ہو؟“

”بابی! میں ہفتہ وار بازاروں میں لگنے والے ایک اسٹال پر کام کرتا تھا۔“ اس نے کہنا شروع کیا: ”اسٹال کا مالک ہفتے کے چھ دن اسٹال لگاتا تھا۔ اس کا مال گھر یا گودام جانے کی بجائے ایک بازار سے دوسرے بازار چلا جاتا۔ میں صبح سویرے اسٹال پر پہنچ جاتا اور رات دس گیارہ بجے گھر جاتا، مجھے دو سو روپے روز ملتے تھے۔ ڈیڑھ دو مہینے گزرے تھے۔ ایک رات دن بھر کا تھکا ہوا گھر آیا۔ میری بیوی کی طبیعت خراب ہوئی۔ اسے اسپتال لے جانا پڑا۔ میں ساری رات نہ سو سکا۔ صبح بازار دیر سے پہنچا اور سیٹھ کو بتایا

کہ میری بیوی بیمار ہے۔ میں شام کو جلدی چلا جاؤں گا۔

وہ ناراض ہو کر بولا: ”مجھے کام کے لیے آدمی کی ضرورت ہے۔ تم آئے بھی دیر سے ہو اور شام کو بھی جلدی چلے جاؤ گے۔ سارا کام میں خود کروں گا تو تمھاری کیا ضرورت ہے! جاؤ، ابھی چلے جاؤ، کل صبح جلدی آ جانا۔“

”میں نے کہا: ”میں چھٹی نہیں کر سکتا۔ مجھے رقم کی شدید ضرورت ہے۔ میری بیوی اسپتال میں ہے۔“

سیٹھ بولا: ”کام کرنے کے پیسے ملیں گے اور کام کا ٹائم ختم ہو گیا ہے۔ اب کل آنا۔“

”تو بابی! اس نے مجھے چھٹی دے دی۔ میں نے بہت منت کی کہ آج کام کر لیتا ہوں چاہے مجھے آدھے دن کے پیسے دے دینا، لیکن وہ نہ مانا۔“

”سنا سننے والے اسٹال پر ایک انکل ہوا کرتے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور بولا: ”انکل! مجھے ایک سو روپے دیں، میں واپس نہیں کروں گا۔“

وہ بولے: ”یہ کیا بات ہوئی بھلا؟“

میں نے بتایا کہ میری بیوی اسپتال میں ہے۔ رات بھر اسپتال میں تھا، سو بھی نہیں سکا۔ ابھی دیر سے آیا ہوں تو وہ مجھے کام پر نہیں رکھ رہے۔ میرے پاس کرایہ تک نہیں ہے۔ بیوی کو اسپتال سے گھر لے جانا ہے آپ مجھے سو روپے دے دیں، میں واپس کرنے نہیں آؤں گا۔

(جاری ہے)

پاکستان کا قومی ترانہ

نسرین شاہین

قیام پاکستان کے وقت پاکستان کا قومی پرچم تو موجود تھا، لیکن اس کا قومی ترانہ تیار ہونے کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔ ۱۴- اگست ۱۹۴۷ء کو پرچم کشائی کے موقع پر ایک قومی گیت کی دھن بجائی گئی تھی، لیکن اس کو ترانے کا درجہ نہیں دیا گیا۔ قومی ترانہ ایسے گیت کو کہتے ہیں، جس میں قوم کی امنگوں کی ترجمانی کی گئی ہو۔ یہ کسی قوم یا ملک کی پہچان ہوتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد قومی تقریبات کے موقع پر جب غیر ملکی نمائندوں کی آمد شروع ہوئی تو حکومت پاکستان نے محسوس کیا کہ دوسرے ممالک کی طرح پاکستان کا بھی قومی ترانہ ہونا چاہیے۔ اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے قومی ترانے کے لیے کوششیں شروع کیں۔ وزیر اطلاعات نے مختلف اخبارات میں ایک اشتہار شائع کرایا کہ پاکستان کا قومی ترانہ اور دھن تیار کرنے والے شخص کو دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔ اگر دو افراد شاعری اور دھن علاحدہ علاحدہ لائیں گے تو دس ہزار کی رقم ان میں برابر تقسیم کی جائے گی۔

اشتہار کی اشاعت سے پہلے راولپنڈی میں وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی ملاقات مشہور شاعر حفیظ جالندھری سے ہو چکی تھی۔ اس ملاقات میں وزیر اعظم نے ان سے قومی ترانہ لکھنے اور بعد میں اس کی دھن تیار کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

۲۳ فروری ۱۹۴۹ء کو ایس ایم اکرام کی نگرانی میں ۹ رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی۔

سردار عبدالرب نثر قومی ترانہ کمیٹی کے صدر تھے۔ اس کمیٹی کا پہلا اجلاس یکم مارچ ۱۹۴۹ء کو کراچی میں سردار عبدالرب نثر کے گھر پر ان کی صدارت میں ہوا۔ بعد میں کمیٹی کو دو ذیلی کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا، تاکہ وہ الفاظ اور موسیقی کے سلسلے میں موصولہ نمونوں کا جائزہ لیں۔ اس کمیٹی کو دنیا کے مختلف حصوں سے ترانے اور دھنیں موصول ہوئیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی دھن یا نغمہ معیار پر پورا نہ اتر سکا۔

دوسرے اجلاس میں یہ طے پایا کہ ترانے کی شاعری اور دھن بنانے کی تمام تر ذمہ داری حفیظ جالندھری کو دے دی جائے۔ انھوں نے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور ترانے پر کام شروع کر دیا۔ ممتاز موسیقار عبدالکریم احمد جی چھاگلہ کو قومی ترانے کی دھن تیار کرنے کا فریضہ سونپا گیا۔ انھوں نے پندرہ دنوں میں قومی ترانے کی دھن بنائی۔ یہ دھن پاکستان نیوی کے بینڈ نے ”پی این ایس دلاور“ میں بنائی۔ وارنٹ آفیسر عبدالغفور اس کے بینڈ ماسٹر تھے۔ ۲۱- اگست ۱۹۵۰ء کو یہ دھن منظور کر لی گئی۔

اس دھن کا دورانیہ ۸۰ سیکنڈ ہے اور اسے پاکستان زندہ باد کا نام دیا گیا۔

یکم مارچ ۱۹۵۰ء کو جب ایران کے حکمران رضا شاہ پہلوی پاکستان تشریف لائے تو ان کی آمد پر پاک بحریہ کے بینڈ نے اس ترانے کی دھن بجائی۔ پھر ۵ جنوری ۱۹۵۴ء کو مرکز کی کابینہ نے اس دھن کو سرکاری طور پر قومی ترانہ قرار دے دیا۔

قومی ترانہ کمیٹی نے ۷۲ ترانے رد کرنے کے بعد ۷- اگست ۱۹۵۴ء کو حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا پاکستان کا موجودہ ترانہ ”پاک سرزمین شاد باد“ قومی ترانے کے طور پر منظور کیا گیا۔ اس طرح حفیظ جالندھری کو پاکستان کے قومی ترانے کے بانی کے طور پر منظور کیا گیا۔

ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس پر آپ کو دس ہزار روپے کا انعام دیا گیا۔

پاکستان کا قومی ترانہ سب سے پہلے ۱۳- اگست ۱۹۵۳ء کو ریڈیو پاکستان سے حفیظ جالندھری ہی کی آواز میں نشر کیا گیا۔ قومی ترانہ نشر ہونے کے صرف تین دن بعد یعنی ۱۶- اگست ۱۹۵۳ء کو قومی ترانے کی منظوری کا سرکاری اعلان ہوا اور ۱۴- اگست ۱۹۵۵ء کو حکومت پاکستان نے حفیظ جالندھری سے قومی ترانے کے حقوق خرید لیے۔

۱۹- جنوری ۱۹۵۵ء کو امریکا کے ایک مشہور فلم ساز ادارے نے قومی ترانے کی رنگین فلم تیار کی۔ ۹ جنوری ۱۹۵۷ء کو ملک بھر کے ہائی اسکولوں میں قومی ترانہ ترنم سے پڑھنا اور احتراماً سیدھے کھڑے ہو کر سننا لازمی قرار دیا گیا۔

۱۴- اگست ۱۹۸۱ء میں یومِ آزادی کے موقع پر صبح نو بجے پہلی مرتبہ پاکستانی عوام نے یک آواز ہو کر قومی ترانہ پڑھا۔

پاکستان کا قومی ترانہ شاعری کی صنف ”مخمس“ میں لکھا گیا ہے۔ اس ترانے میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے الفاظ زیادہ ہیں۔ اردو زبان کا صرف ایک لفظ ”کا“ استعمال ہوا ہے۔

قومی ترانہ لکھنے میں حفیظ جالندھری کو چھ ماہ لگے، کیوں کہ قومی ترانے کے ایک ایک لفظ پر غور کیا گیا۔

قومی ترانے میں گیارہ گلوکاروں کی آوازیں شامل ہیں۔ ہمارا قومی ترانہ دنیا کے خوب صورت ترانوں میں شمار ہوتا ہے۔

☆☆☆

علم کی انتہا جہالت ہے

ایک دن حلیم اور سلیم دونوں اپنے ابا کے ساتھ سیر کو گئے۔ حلیم بڑا تھا اور سلیم چھوٹا، لیکن سمجھ دار اپنے بڑے بھائی سے زیادہ تھا۔ اپنے قصبہ سے ذرا دور چلے تھے کہ ایک چھوٹی سی پہاڑی دکھائی دی۔ دونوں نے ابا سے کہا کہ آج تو ہم اس پہاڑی کی سیر کریں گے۔ ابا نے کہا کہ چلو، آج پہاڑی پر چلو، اس میں کیا حرج ہے۔ پہاڑی پر چڑھ کر حلیم اور سلیم بہت خوش ہوئے۔ ذرا اور اوپر چڑھے تو قصبہ کے مکان نظر آنے لگے، مگر بڑے بڑے مکان چھوٹے چھوٹے گھر وندے معلوم ہو رہے تھے۔ چوڑی چوڑی سڑکیں ذرا ذرا سی گلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ چڑھتے چڑھتے اب یہ تینوں پہاڑی کے بالکل اوپر پہنچ گئے۔

”اوہو!“ سلیم کے منہ سے بے اختیار نکلا: ”یہاں سے تو سارا قصبہ ہی دکھائی دینے لگا۔“ حلیم نے کہا: ”پہاڑی کے نیچے تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔“

ابا نے کہا: ”دیکھا تم نے، اونچائی پر پہنچنے کا مزہ۔ اب تم اگر اس سے زیادہ اونچے پہاڑ پر، وہ جو سامنے نظر آ رہا ہے اس پہاڑ پر چڑھ کر دیکھو تو تمہیں اپنا قصبہ ہی نہیں، پاس پڑوس کے دوسرے قصبے بھی نظر آنے لگیں گے۔ آدمی جتنا اونچا ہوتا جاتا ہے، اس کی نگاہ اتنی ہی وسیع ہوتی جاتی ہے۔ تم نے شاید کسی کو کہتے سنا ہو کہ علم کی انتہا جہالت ہے۔“

حلیم جلدی سے بولا: ”واہ! اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے،

آدمی پڑھ لکھ کر جاہل ہو جاتا ہے۔“

سلیم کے بجائے ابا نے جواب دیا: ”نہیں حلیم! یہ مطلب نہیں جو تم سمجھ ہو۔ تم ابھی کہہ رہے تھے کہ پہاڑی کے نیچے کچھ دکھائی نہیں دیتا پھر جیسے جیسے اوپر چڑھتے جاتے ہیں، ویسے ویسے دور دور کی چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ جب آدمی نیچے ہوتا ہے تو اسے کچھ نہیں معلوم ہوتا، لیکن جب اوپر چڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ارے اس سے پہلے تو مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ بس اسی طرح علم کا معاملہ ہے۔

جب آدمی کچھ بھی پڑھا لکھا نہیں ہوتا تو اسے اپنی جہالت کا خیال بھی نہیں آتا، لیکن جب وہ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیتا ہے تو اسے کچھ کچھ خیال ہونے لگتا ہے کہ ابھی علم اور حاصل کرنا چاہیے۔ اسی طرح وہ اپنا علم بڑھاتا جاتا ہے اور اس کا یہ خیال یا یہ احساس کہ اس کا علم اور اس کی معلومات ابھی بہت کم ہے، بڑھتا جاتا ہے۔ وہ علم کے پہاڑ پر چڑھتا جاتا ہے، بلندی کو چھوتا جاتا ہے اور اس کی بے خبری، بے علمی اور جہالت اس کے سامنے آتی جاتی ہے۔ جتنا علم زیادہ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی وہ اپنے آپ کو ناواقف اور جاہل سمجھتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ علم کی انتہا جہالت ہے۔“

سلیم اور حلیم نے کہا: ”ابا جان! اب ہم سمجھ گئے۔ پہاڑ کی مثال سے بہت آسانی سے بات ذہن میں آگئی۔“ اور وہ سب خوشی خوشی گھر لوٹ آئے۔

(ہمدرد نو نہال ستمبر ۱۹۵۷ء کی ایک تحریر)

☆☆☆

خالی پنجرہ

نذیر انبالوی

رحمت سر جھکائے ہوئے کھڑا تھا۔ زمین پر رکھا تو تے کا پنجرہ خالی تھا۔ سروش تو تے کا خالی پنجرہ دیکھ کر غصے سے رحمت کو گھور رہا تھا کہ دادی جان آگئیں۔ وہ دادی جان کو دیکھ کر فوراً بولا: ”دادی جان، دادی جان! رحمت نے میرا مٹھو اڑا دیا ہے، اسے نوکری سے نکال دیں۔“

رحمت جلدی سے بولا: ”میں نے مٹھو کو جان بوجھ کر نہیں اڑایا۔ میں پنجرے کی صفائی کرنے لگا تو غلطی سے پنجرہ کھل گیا تھا۔ کھلا پنجرہ دیکھ کر مٹھو میری آنکھوں کے سامنے اڑ کر درخت پر جا بیٹھا، میں نے مٹھو کو پوری اور امروہ، کیلے کا لالچ بھی دیا، جواب میں وہ ایک بات کہتا، جو چھوٹے صاحب نے اُسے یاد کروائی تھی۔“

”کون سی بات؟“ دادی جان نے رحمت سے پوچھا۔

”اماں بی! مٹھو میری ہر بات پر کہتا، آزادی زندہ باد..... آزادی زندہ باد۔“

”میں نے بہت مشکل سے اپنے پیارے مٹھو کو یہ جملہ یاد کروایا تھا۔ ہائے، میرا پیارا مٹھو اڑ گیا۔ اب وہ نہ جانے کہاں ہوگا۔“ یہ کہتے ہوئے سروش رو دیا۔

”سروش بیٹا! رومت، تمہارے بابا تمہیں ایک اور مٹھولا دیں گے۔“

”وہ میرے پہلے مٹھو جیسا تو نہیں ہوگا۔ اُسے میرا اور گڑیا کا نام یاد تھا۔“

رات کے کھانے کے دوران بابا جان نے پوچھا: ”آج مٹھو کیوں اتنا خاموش ہے؟“

یہ جملہ سننے کی دیر تھی کہ سروش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ مشکل سے بول پایا تھا:

”میرے مٹھو کو رحمت نے اڑا دیا ہے۔ اب پنجرہ خالی ہے۔ مٹھو کے بغیر پنجرہ سونا سوتا ہے۔“

ابو نے تسلی دیتے ہوئے کہا: ”سروش میاں! آپ اپنا دل چھوٹا مت کریں۔ کل آپ کا نیا مٹھو آ جائے گا، پنجرہ اب سونا سونا نہیں رہے گا۔“

اگلے دن ایک بڑے سے پنجرے میں نیا تو تا گھر میں آ گیا۔ سب گھر والے پنجرے کے ارد گردیوں کھڑے تھے جیسے نئے توتے کا استقبال کر رہے ہوں۔

”میں نئے مٹھو کو ہر وہ بات یاد کراؤں گا، جو میرے پہلے والے مٹھو کو یاد تھی۔“

گھر میں نیا مٹھو کیا آیا، سروش اور گڑیا اُسے ہر وقت کچھ نہ کچھ یاد کرواتے دکھائی دیتے۔ کئی دن گزر گئے، مگر دونوں کوشش کے باوجود مٹھو کو ایک لفظ بھی یاد نہ کروا سکے تھے۔ ان حالات میں سروش کو اپنا پہلا مٹھو یاد آنے لگا تھا۔ کاش، میرا مٹھو واپس آ جائے۔ میں اُسے مزے دار امرود اور کیلے کھلاؤں گا، کاش، ایسا ہو جائے۔

ایک دن سروش اسکول سے آیا تو دروازے کے پاس رکھے پنجرے میں قید مٹھو نے ”سروش، سروش“ پکارا تو سروش کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ تیزی سے پنجرے کی طرف بڑھا۔ پنچوں کے بل بیٹھ کر مٹھو کو مخاطب کیا: ”دوبارہ کہو سروش، ہاں بولو، سروش..... بولو..... بولو۔“

کچھ دنوں کی مشق اور کوشش کے بعد مٹھو ”گڑیا، گڑیا“ بھی پکارنے لگا۔ وقت کے ساتھ ساتھ نیا مٹھو بھی بہت کچھ سیکھ گیا۔ اب تو نیا مٹھو ”آزادی زندہ باد“ کانفرہ بھی بلند کرنے لگا تھا۔ نئے مٹھو نے پرانے مٹھو کی جگہ لے لی تھی۔ اب خالی پنجرہ دیکھ کر سروش کو کبھی پرانے مٹھو کی یاد نہیں آتی تھی۔ پہلے تو تے کی طرح نئے توتے نے بھی سروش کے دل میں گھر کر لیا تھا۔

ایک شام سروش اور گڑیا سیر کرنے کے لیے قریبی باغ میں گئے۔ رحمت کے ہاتھ میں مٹھو

کا پنجرہ تھا۔ رحمت نے ایک درخت کے نیچے پنجرہ رکھا تو مٹھو نے درخت پر بیٹھے ایک توتے کو دیکھا۔ تو تا مسلسل ٹائیں ٹائیں کر رہا تھا۔ وہ ایک درخت سے دوسرے اور پھر تیسرے درخت پر جا بیٹھتا تھا۔ وہ اپنی چونچ سے پکے آموں کو کھاتا اور آبشار سے پانی پیتا۔ پنجرے میں بند مٹھو کبھی سروش اور کبھی گڑیا کو پکارتا۔ وہ کبھی کبھار ”آزادی زندہ باد“ کانفرہ بھی بلند کرتا۔ سروش اور گڑیا باغ میں کھیل رہے تھے، جب کہ رحمت مٹھو کے پنجرے کے پاس بیٹھا تھا۔ جب مٹھو آزادی زندہ باد کہتا تو رحمت فوراً کہتا: ”آزاد تو وہ ہے، اپنی مرضی سے اُڑ رہا ہے، کھاپی رہا ہے، تم تو غلام ہو، قیدی ہو، اللہ کرے، تمہیں ایک دن غلامی سے نجات اور آزادی نصیب ہو جائے۔“

رحمت کی باتیں سن کر مٹھو زور زور سے ”آزادی زندہ باد“ کانفرہ بلند کرتا تو یوں محسوس ہوتا، جیسے وہ رحمت کی باتیں اچھی طرح سمجھ رہا ہے۔

ایک دن جب سروش، گڑیا اور رحمت بازار سے گھر واپس آ رہے تھے تو ایک گاڑی تیزی سے اُن کے پاس آ کر رکی تھی۔ دو آدمی گاڑی سے نکلے اور سروش کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال دیا۔ یہ عمل اتنی تیزی سے ہوا کہ گڑیا اور رحمت شور بھی نہ مچا سکے۔ سڑک پر زیادہ بھیڑ نہ تھی، اس لیے گاڑی جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ رحمت نے اپنے موبائل فون سے سروش کے ابو آفتاب صاحب کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ تھوڑی دیر میں وہ موقع واردات پر پہنچ گئے۔ رحمت اور گڑیا کی زبانی سارا ماجرا جان کر انسپکٹر توحید نے آفتاب صاحب سے پوچھا: ”آپ کو کسی پر شک ہے؟“

”میں نے چند ماہ قبل دفتر میں چوری کرنے پر ایک ملازم رضا کو ملازمت سے نکال دیا تھا، ہو سکتا ہے، یہ اُس کی کارروائی ہو۔“ انھوں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”میں رضا کو شامل تفتیش کر رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کا بیٹا جلد گھر لوٹ آئے“

گا۔ اگر کوئی آپ سے رابطہ کرتے تو ہمیں فوراً اطلاع کیجیے گا۔“

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ آفتاب نے انپکٹر تو حید کی بات سن کر کہا۔

سروش ایک نیم تاریک کمرے میں موجود تھا، کمرے کا دروازہ بند تھا۔

”مجھے باہر نکالو، مجھے اپنے گھر جانا ہے، دروازہ کھولو۔“ سروش روتے ہوئے

مسلل التجا کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو ایک شخص جس نے رومال سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا،

کمرے میں داخل ہوا۔ سروش دروازہ کھلا دیکھ کر باہر نکلنے لگا تو اندر آنے والے شخص نے

اس کا بازو اتنی زور سے پکڑا کہ وہ درد سے ہلپلا اٹھا۔

”مجھے باہر جانے دو، مجھے اپنے گھر جانا ہے۔“ سروش نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

”تم گھر تو اسی وقت جاؤ گے جب تمہارا باپ مجھے میری مطلوبہ رقم دے گا۔ بہت

دولت ہے تمہارے باپ کے پاس، تھوڑا سا پیسہ ہمیں دے دے گا تو اسے کون سا فرق

پڑے گا۔ بیٹھ جاؤ آرام سے، زیادہ شور مچایا تو اپنی جان سے جاؤ گے۔“

”مجھ پر رحم کرو، مجھے جانے دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے! مجھے گھر جانے دو۔“

سروش نے روتے ہوئے کہا۔

”بگاڑا تم نے نہیں، کام تو تمہارے باپ نے بگاڑا ہے، دفتر سے ایک لیپ ٹاپ کیا

اٹھالیا، اس نے ملازمت ہی سے فارغ کر دیا۔ مجھے ملازمت سے نکالنا آفتاب صاحب کو

بہت منہگا پڑے گا۔“ یہ کہہ کر اس آدمی نے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا۔

سروش روتا پیتا رہا، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

رات کے وقت کمرے میں مدھم بلب کی نیلی ہلکی روشنی تھی۔ ایک طرف پانی کی

بول اور کھانا رکھا تھا، مگر سروش نے اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس نے سوچا بھی نہ

تھا کہ وہ اس طرح کی صورت حال سے دوچار ہوگا۔ وہ جماعت ہفتم کا طالب علم تھا۔ اسے

مردعائیں یاد تھیں، وہ انھیں بار بار پڑھ رہا تھا۔ دعا کرتے ہوئے اسے پنجرے میں بند مٹھو

ہا خیال آ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ مٹھو بھی اس کی آنکھوں کے سامنے تھا، جسے کافی مدت پنجرے

میں قید رکھا گیا تھا۔ رحمت سے پنجرہ کھلا رہ گیا تھا، تب اسے آزادی ملی تھی۔ اب ایک اور

مٹھو اس کی قید میں تھا۔ جو پکار پکار کر ”آزادی زندہ باد“ کے نعرے بلند کرتا تھا۔

”میرے اللہ! مجھے معاف کر دے، مجھے آزادی عطا کر دے، میں وعدہ کرتا ہوں،

یہاں سے آزاد ہوتے ہی مٹھو کو آزاد کر دوں گا۔ میرے اللہ مجھے آزادی عطا کر دے۔“

سروش نے روتے ہوئے دعا کی۔

رخصت نے آفتاب صاحب سے تاوان کے لیے رابطہ کیا تو آفتاب نے اس کی اطلاع

انپکٹر تو حید کو کر دی۔ انپکٹر تو حید نے جدید آلات کی مدد سے رضا کے فون کرنے کی جگہ کو

تلاش کر لیا۔ یوں تو رضا ہر بار موبائل فون کی بسم بدل بدل کر آفتاب صاحب کو فون کرتا، مگر

وہ ایک ہی جگہ سے فون کر رہا تھا۔ انپکٹر تو حید نے رات کے آخری پہر اس جگہ کا محاصرہ کیا

اور جلد ہی اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے۔

سروش کچھ نہ کھانے پینے کے باعث نڈھال سا ہو گیا تھا۔ انپکٹر تو حید نے اسے پانی پلایا

تو اس کی جان میں جان آئی۔ تھانے میں جب وہ بابا جان سے بغل گیر ہوا تو بے اختیار رو دیا۔

ایک رات کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

آ گیا تو اس کی قید نے اسے آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ جب وہ بابا جان کے ساتھ گھر

پہنچا تو دادی اور امی نے اس کی بلائیں لیں۔ گڑیا نے محبت سے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ مٹھو بھی سروش، سروش پکار رہا تھا۔ سروش نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر مٹھو کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا۔

”مٹھو! اُڑ جاؤ..... دیر مت کرو۔“

مٹھو نے پنجرہ کھلا دیکھا تو تیزی سے پنجرے سے نکل کر درخت پر جا بیٹھا۔ سروش نے مٹھو کو مخاطب کیا: ”میرے پیارے مٹھو! آزادی مبارک ہو، فضاؤں میں اُڑو، آزاد زندگی گزارو، آزادی کی زندگی جیو، پیارے مٹھو! ایک دفعہ پھر آزادی مبارک..... آزادی مبارک۔“
یہ سن کر مٹھو ”آزادی زندہ باد“ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے پھر سے اُڑ گیا۔ ☆

گھر کے ہر فرد کے لیے مفید

ماہنامہ ہمدرد صحت۔

صحت کے طریقے اور جینے کے قرینے سکھانے والا رسالہ

✽ صحت کے آسان اور سادہ اصول ✽ نفسیاتی اور ذہنی الجھنیں

✽ خواتین کے صحتی مسائل ✽ بڑھاپے کے امراض ✽ بچوں کی تکالیف

✽ جڑی بوٹیوں سے آسان فطری علاج ✽ غذا اور غذائیت کے بارے میں تازہ معلومات

ہمدرد صحت آپ کی صحت و مسرت کے لیے ہر مہینے قدم اور جدید

تحقیقات کی روشنی میں مفید اور دل چسپ مضامین پیش کرتا ہے

رنگین نائٹل --- خوب صورت گٹ اپ --- قیمت: صرف ۲۰ روپے

اچھے بک اسٹالز پر دستیاب ہے

ہمدرد صحت، ہمدرد سینٹر، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد، کراچی

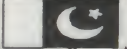
طاقت ور بے وقوف

غلام یلین نوٹاری



یہ ایک طاقت ور، لیکن ایک بے وقوف انسان کی کہانی ہے۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا، لیکن وہ جواراٹا کے عجیب و غریب نام سے مشہور تھا۔ جواراٹا بے حد طاقت ور، لیکن احمق شخص تھا۔ وہ ایک وقت میں پچاس افراد کا کھانا کھا لیتا تھا۔ اس کا باپ بہت پریشان تھا، کیوں کہ وہ کھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔

ایک روز کسی نے جواراٹا کو بتایا کہ شمالی پہاڑوں کے پیچھے ایک وادی ہے۔ اس کا نام اگنستان ہے۔ وہاں بہت بڑا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ اگر تم وہ خزانہ حاصل کر لو تو تمھاری ساری زندگی عیش میں گزرے گی۔



جواراٹا یہ سن کر بے حد خوش ہوا اور اسی دن وہ وادی کی طرف چل دیا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ رات اس نے ایک گاؤں میں گزاری۔ صبح ہونے کے بعد وہ اپنا سفر کرنے ہی والا تھا کہ گاؤں کے چودھری نے اسے بلایا اور کہا: ”نو جوان! تم مجھے بہت طاقت ور لگتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس رہو، کام کرو، میں تمہیں مال کر دوں گا۔“

جواراٹا نے کہا: ”چودھری صاحب! میں فی الحال ایک عظیم خزانے کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ مجھے تھوڑے سے مال کی ضرورت نہیں ہے۔“

چودھری صاحب خاموش ہو گئے۔ وہ چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ ایک جنگل سے گزرا۔ اس کی نگاہ ایک ہرن پہ پڑی۔ وہ اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ ہرن بھی بھاگنے لگا، مگر جواراٹا بھی بہت تیز دوڑتا تھا، اس نے جلد ہی ہرن کو پکڑ لیا۔

ہرن نے کہا: ”تم مجھے چھوڑ دو تو میں تمہیں اس جنگل میں دفن ایک خزانے کا پتا بتا سکتا ہوں۔ خزانہ اتنا زیادہ ہے کہ تم صدیوں تک استعمال کرو، تب بھی ختم نہ ہوگا۔“

جواراٹا نے تہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ”تم مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ میں اس سے بھی بڑے ایک خزانے کی تلاش میں نکلا ہوں۔“

جواراٹا نے ہرن کو مار کر آگ پہ بھون لیا اور کھاپی کر آگے روانہ ہوا۔ آخر وہ شمالی پہاڑیوں کے قریب جا پہنچا۔ کچھ دور ایک بزرگ بیٹھے عبادت کر رہے تھے۔ بزرگ نے جواراٹا کو آتے دیکھا تو اسے اپنے پاس بلایا۔ قریب پہنچ کر جواراٹا نے پوچھا: ”اے بزرگ! کیا آپ وادی اگستان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟“

بزرگ نے بتایا: ”یہ وادی، موت کی وادی ہے۔ وہاں جو بھی گیا، بچ کر واپس نہ آیا۔ اگر تم وہاں جانے کا ارادہ کیے بیٹھو تو میری مانو، مت جاؤ۔ وہاں صرف موت ہے۔“

جواراٹا نے تہقہہ لگایا اور بولا: ”میں کوئی بزدل آدمی نہیں ہوں، اگر وہاں کوئی دیو



بھی ہے تو اسے اٹھا کر پھینک دوں گا۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا۔“

بزرگ نے اسے قابلِ رحم نظروں سے دیکھا، مگر کچھ نہ کہا۔ بزرگ کو یقین تھا کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔

آخر جواراٹا وادی اگستان کے دروازے پہ پہنچ گیا۔ آگے جو کچھ ہوا، بُرا ہوا۔ جواراٹا چاہتا تو اپنی طاقت سے خود بھی فائدہ اٹھاتا اور دوسروں کے کام آ کر سکون پاتا۔ وہ جتنا طاقت ور تھا، اتنا ہی بے وقوف بھی تھا۔ اس نے لالچ میں پڑ کر گاؤں کے چودھری صاحب کی عمدہ پیش کش ٹھکرا دی۔ ہرن خزانے کا راز بتا رہا تھا تو اسے ہلاک کر دیا۔ ایک نیک دل بزرگ نے اسے بہت سمجھایا، لیکن وہ آخر تک اپنے آپ کو عقل مند سمجھتا رہا۔ وادی کے دروازے پر ایک نظر نہ آنے والے ہاتھ نے اسے پکڑ کر کھینچ لیا۔ آج تک اس کا پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گیا۔ ☆

طاقت ور بے وقوف

غلام یلین نواری



یہ ایک طاقت ور، لیکن ایک بے وقوف انسان کی کہانی ہے۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا، لیکن وہ جوارانا کے عجیب و غریب نام سے مشہور تھا۔ جوارانا بے حد طاقت ور، لیکن احمق شخص تھا۔ وہ ایک وقت میں پچاس افراد کا کھانا کھا لیتا تھا۔ اس کا باپ بہت پریشان تھا، کیوں کہ وہ کھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ ایک روز کسی نے جوارانا کو بتایا کہ شمالی پہاڑوں کے پیچھے ایک وادی ہے۔ اس کا نام اکستان ہے۔ وہاں بہت بڑا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ اگر تم وہ خزانہ حاصل کر لو تو تمہاری ساری زندگی عیش میں گزرے گی۔

HEEEELLLLLPPPPPPPPPP!!!!

The sun is about to set and Momi & Auzi have lost their way to the House of Saniplast Junior. Come on friends, help them before it gets dark.



Uniferoz

f saniplasthumeshapass



بھی ہے تو اسے اٹھا کر پھینک دوں گا۔ میں وہاں ضرور جاؤں گا۔“

بزرگ نے اسے قابلِ رحم نظروں سے دیکھا، مگر کچھ نہ کہا۔ بزرگ کو یقین تھا کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔

آخر جوارانا وادیِ اکنتان کے دروازے پہ پہنچ گیا۔ آگے جو کچھ ہوا، بُرا ہوا۔ جوارانا چاہتا تو اپنی طاقت سے خود بھی فائدہ اٹھاتا اور دوسروں کے کام آ کر سکون پاتا۔ وہ جتنا طاقت ور تھا، اتنا ہی بے وقوف بھی تھا۔ اس نے لالچ میں پڑ کر گاؤں کے چودھری صاحب کی عمدہ پیش کش ٹھکرا دی۔ ہرن خزانے کا راز بتا رہا تھا تو اسے ہلاک کر دیا۔ ایک نیک دل بزرگ نے اسے بہت سمجھایا، لیکن وہ آخر تک اپنے آپ کو عقل مند سمجھتا رہا۔ وادی کے دروازے پر ایک نظر نہ آنے والے ہاتھ نے اسے پکڑ کر کھینچ لیا۔ آج تک اس کا پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گیا۔ ☆

جوارانا یہ سن کر بے حد خوش ہوا اور اسی دن وہ وادی کی طرف چل دیا۔ چلتے چلتے شام ہو گئی۔ رات اس نے ایک گاؤں میں گزاری۔ صبح ہونے کے بعد وہ اپنا سفر کرنے ہی والا تھا کہ گاؤں کے چودھری نے اسے بلایا اور کہا: ”نوجوان! تم مجھے بہت طاقت ور لگتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے پاس رہو، کام کرو، میں تمہیں مالا مال کر دوں گا۔“

جوارانا نے کہا: ”چودھری صاحب! میں فی الحال ایک عظیم خزانے کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ مجھے تھوڑے سے مال کی ضرورت نہیں ہے۔“

چودھری صاحب خاموش ہو گئے۔ وہ چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ ایک جنگل سے گزرا۔ اس کی نگاہ ایک ہرن پہ پڑی۔ وہ اس کے پیچھے دوڑنے لگا۔ ہرن بھی بھاگنے لگا، مگر جوارانا بھی بہت تیز دوڑتا تھا، اس نے جلد ہی ہرن کو پکڑ لیا۔

ہرن نے کہا: ”تم مجھے چھوڑ دو تو میں تمہیں اس جنگل میں دفن ایک خزانے کا پتا بتا سکتا ہوں۔ خزانہ اتنا زیادہ ہے کہ تم صدیوں تک استعمال کرو، تب بھی ختم نہ ہوگا۔“

جوارانا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ”تم مجھے بے وقوف مت سمجھو۔ میں اس سے بھی بڑے ایک خزانے کی تلاش میں نکلا ہوں۔“

جوارانا نے ہرن کو مار کر آگ پہ بھون لیا اور کھاپی کر آگے روانہ ہوا۔ آخر وہ شمالی پہاڑیوں کے قریب جا پہنچا۔ کچھ دور ایک بزرگ بیٹھے عبادت کر رہے تھے۔ بزرگ نے جوارانا کو آتے دیکھا تو اسے اپنے پاس بلایا۔ قریب پہنچ کر جوارانا نے پوچھا: ”اے بزرگ! کیا آپ وادیِ اکنتان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟“

بزرگ نے بتایا: ”یہ وادی، موت کی وادی ہے۔ وہاں جو بھی گیا، بچ کر واپس نہ آیا۔ اگر تم وہاں جانے کا ارادہ کیے بیٹھو تو میری مانو، مت جاؤ۔ وہاں صرف موت ہے۔“ جوارانا نے قہقہہ لگایا اور بولا: ”میں کوئی بزدل آدمی نہیں ہوں، اگر وہاں کوئی دیو



”آپ میرے دفتر میں کیا کر رہے ہیں؟“ انسپکٹر کاشان نے ماتھے پر تیوری چڑھاتے ہوئے سب انسپکٹر ظفر دلاوری سے پوچھا۔ وہ ایک ضروری مٹینگ سے فارغ ہو کر پولیس اسٹیشن پہنچے تھے۔ سب انسپکٹر دلاوری کو اپنے دفتر میں دیکھ کر انھیں غصہ آ گیا۔ یہ شخص انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔

”میں..... دراصل وہ مجھے اپنی ایک فائل نہیں مل رہی تھی۔ میں نے سوچا، کہیں آپ کے کمرے میں نہ بھول آیا ہوں۔ سر! میں معافی چاہتا ہوں۔“ انسپکٹر دلاوری اپنے مخصوص انداز میں دانت نکالتے ہوئے بولا۔

انسپکٹر کاشان نے لمبی سانس لی اور اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا: ”آپ



فورا اپنے کمرے کا رخ کریں..... اور ہاں، شاداب نگر کے کیس کا کیا بنا؟ میں نے آپ کو گواہوں سے دوبارہ ملنے کے لیے کہا تھا۔“
 سب انسپکٹر دلاوری واپس جاتے ہوئے گھبرا کر مڑا اور ہکلاتے ہوئے بولا: ”دراصل میں گشت میں مصروف رہا اور.....“

انسپکٹر کا شان نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا: ”مجھے کل صبح دس بجے اس کیس کے بارے میں تفصیلی رپورٹ چاہیے۔“

انسپکٹر کا شان ابھی ٹھیک طرح سے کرسی پر نہیں بیٹھے تھے کہ برآمدے میں ایک شور سا ہوا۔ انھوں نے اردلی کو بلایا اور اس شور کی وجہ پوچھی۔

”جناب! دو سپاہی ایک جوان آدمی کو پکڑ کر لائے ہیں۔ یہ شور اسی نے مچا رکھا ہے۔ ڈیوٹی آفیسر اسے اپنے کمرے کی طرف لے جا رہے ہیں۔“ اردلی نے اطلاع دینے والے انداز میں بتایا۔



”ڈیوٹی آفیسر سے کہیں کہ اس آدمی کو میرے پاس لے آئیں۔“ انسپکٹر کا شان نے ہدایت دیں۔

تھوڑی دیر بعد سپاہی ایک شخص کو ہتھکڑیاں لگے ایک شخص کو سامنے لے آیا۔ انسپکٹر کا شان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا: ”جناب یہ آدمی بہت بد بخت ہے۔ نشے کا عادی ہے۔ اس کی عمر اور اس کا قد کاٹھ دیکھیں..... اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی اور صحت سے کھیل رہا ہے۔ ماں باپ اور محلے داروں کا ناک میں دم کر کھا ہے اس نے۔ اس کا بدنصیب باپ بھی باہر کھڑا ہے۔“ انسپکٹر کا شان نے ملزم کے باپ کو فوراً اندر بلایا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ سر پر ٹوپی، سرور داڑھی کے آدھے سے زیادہ بال سفید، چہرے پر مایوسی، آنکھوں میں درد اور بے چارگی۔ وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔

”جناب! میں اس بدنصیب کا باپ ہوں۔ میرا نام بشیر انصاری ہے۔ میری کپڑے کی چھوٹی سی دکان ہے۔ گھر کا خرچ بڑی مشکل سے چلتا ہے۔ میری تین بیٹیاں بھی گھر پر بیٹھی ہیں۔ یہ کم بخت میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کا نام کبیر ہے۔“

انسپکٹر کا شان قدرے مصروف تھے، لیکن اس کیس میں انھیں دل چسپی محسوس ہو رہی تھی۔ انھوں نے ایک نظر کبیر کی طرف دیکھا، جو نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ وہ ایک دراز قد جوان تھا۔ عمر تیس بتیس سال کے لگ بھگ۔ سر کے بال گھنے، لیکن اُلجھے ہوئے۔ چہرے پر نشے کے عادی افراد کی مخصوص خوست۔ داڑھی کے بال بڑھے ہوئے اور کپڑے میلے کچیلے۔ انسپکٹر کا شان نے اس کے والد سے پوچھا: ”یہ نشے کا عادی کب سے ہوا اور آج اس نے کیا حرکت کی کہ خود آپ نے پولیس کے ہاتھوں اسے گرفتار کروا دیا؟“

”جناب! میں وہی عرض کر رہا تھا۔ اس نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی، کیوں کہ پڑھائی

میں دل چسپی نہیں لیتا تھا۔ میں نے اسے دکان پر بٹھایا تو دکان بند ہونے کے بعد بڑے دوستوں کی صحبت میں رہنے لگا۔ اسی دوران اس کو نشے کی لت پڑ گئی۔ میرا قصور یہ ہے کہ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کے لاڈ اٹھاتا رہا اور اس کی بڑی حرکتوں کو نظر انداز کرتا رہا۔ اب تو اس کی حالت یہ ہے کہ جب نشہ پورا کرنے کے لیے پیسے نہیں ملتے تو مار پیٹ پر اتر آتا ہے۔ آج شام سے ہی اس نے گھر میں اُدھم مچا رکھا تھا۔ نشے کے لیے پیسے مانگ رہا تھا۔ گھر میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ برتن تک توڑ ڈالے کہ کسی گلاس یا پیالی میں پیسے چھپا کے رکھے نہ ہوں۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو ماں کے پاس آیا۔ ماں سمجھانے لگی تو اسے برسی طرح دھکا دیا کہ فرش پر گر دیا۔ بہنوں کو الگ مارتا ہے۔“ بشیر انصاری کی آواز بھر انگلی: ”محلے والوں کی مدد سے بڑی مشکل سے اسے قابو میں کر کے اب تھانے میں خود لے کر آیا ہوں۔ میری طرف سے اسے پھانسی پر لٹکا دین یا ہڈی پیلی ایک کر دیں، ہمارے لیے یہ مر چکا ہے۔“ بوڑھا باپ سسکیاں بھر رہا تھا۔

انسپکٹر کا شان کی آنکھوں میں اچانک ایک چمک پیدا ہوئی۔ انھوں نے ڈیوٹی آفیسر کو اشارے سے بلایا اور اس کے کان میں چپکے سے کوئی بات کہی۔ وہ اقرار میں سر ہلا کر اور سیلوٹ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”اسے لے کر حوالات میں بند کر دو۔“ انسپکٹر کا شان نے سپاہیوں کو حکم دیا اور پھر بشری انصاری سے مخاطب ہوئے: ”آپ اپنی شکایت درج کروائیں۔ میں اس کا مزاج ابھی درست کرتا ہوں۔“

انسپکٹر کا شان اپنے کام میں ایسے مصروف ہوئے کہ انھیں پتا ہی نہ چلا اور آدھی رات کا وقت ہو گیا۔ اردلی نے اندر آ کر اطلاع دی کہ ملزم کبیر کی والدہ آئی ہیں۔

بشیر انصاری بھی اس کے ساتھ ہے اور وہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

بشیر انصاری نے بے چارگی سے انسپکٹر کا شان کی طرف دیکھا اور کہا: ”جناب! یہ بے چاری آخر ماں ہے۔ رو رو کر کہہ رہی تھی کہ کبیر بھوکا پیاسا ہے، اس کے لیے کھانا لے جاؤ۔ پھر کہنے لگی کہ نہ جانے حوالات میں ننگے فرش پر اس سردی میں کیسے سوئے گا، اس کے لیے بستر لے جاؤ۔ اگر اجازت دیں تو یہ دونوں چیزیں حوالات میں پہنچا دوں؟“

انسپکٹر کا شان نے کہا: ”یہ دونوں چیزیں میرے دفتر میں لے آئیں۔ میں اپنے عملے کے ذریعے پہنچا دوں گا، آپ گھر تشریف لے جائیں۔“

دونوں سلام کر کے باہر چلے گئے، انسپکٹر کا شان کو یقین تھا کہ بشیر انصاری ساری رات تھانے کے احاطے میں گزارے گا اور کبیر انصاری کی ماں بھی رات بھر انگاروں پر لوٹی رہے گی۔

انسپکٹر کا شان نے بستر اور کھانے کے برتنوں کو ایک نظر دیکھا۔ پھر کھانے کے برتنوں کو کھول کر گہری نظر سے جائزہ لیا۔ جس چیز کی انھیں تلاش تھی، وہ جلد ہی مل گئی۔ انھوں نے اسے مٹھی میں دبایا اور اردلی کو اندر طلب کیا۔

”یہ بستر اور کھانے کے برتن حوالات میں کبیر کو دے دو اور دیکھو! ڈیوٹی آفیسر واپس آ گئے ہیں یا نہیں؟“

”جناب!“ اردلی نے ادب سے جواب دیا: ”جب میں اندر آ رہا تھا تو ڈیوٹی آفیسر تھانے میں داخل ہو رہے تھے۔“

”ٹھیک ہے، انھیں میرے پاس بھیجو۔“

تھوڑی دیر بعد ڈیوٹی آفیسر ایک خوف ناک چہرے والے شخص کو تھکڑیوں میں لے کر اندر داخل ہوا۔

”آخردلدار پوڈری، پکڑا ہی گیا۔“ آنے والے شخص کو دیکھتے ہی انسپکٹر کا شان جوش میں آ کر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اس شہر کا نامی گرامی منشیات فروش اور اس علاقے کا سب سے گھنیا مجرم۔“ انھوں نے نفرت سے کہا۔

دلدار اپنا انجام سوچ کر لرز رہا تھا اور اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ انسپکٹر کا شان نے اپنی بند مٹھی کھولی اور میں دبی ہوئی نشہ آور پاؤڈر کی پو یا دلدار کے سامنے لہراتے ہوئے کہا: ”مجھے یقین تھا کہ کبیر کی ماں ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر تم سے نشہ خریدے گی اور کھانے کے برتنوں میں چھپا کر اس تک پہنچانے کی کوشش کرے گی، اس لیے میں نے ڈیوٹی آفیسر کو فوری طور پر بشیر انصاری کے گھر روانہ کیا تھا کہ چھپ کر ممتا کی ماری ماں کے تعاقب میں جائے اور اصل مجرم تک جا پہنچے۔۔۔۔۔ تم نے کتنے گھر اجاڑے ہوں گے، کتنی ماؤں کو تڑپایا ہوگا۔ اب تم سے تمھارے ایک ایک جرم کا حساب ہوگا۔“

”سرکار، سرکار! رحم“ دلدار نے معافی مانگنے کے انداز میں ہاتھ جوڑے ہوئے تھے اور گھٹنوں کے بل گر کے منت کر رہا تھا۔

”تم کسی رحم کے قابل نہیں اور تم سے زیادہ بڑا مجرم وہ ہے، جس کے تم کا رندے ہو۔ اس کا نام سیدھی طرح بتاؤ گے یا تمھیں اٹالٹا کا پڑے گا؟“

ڈیوٹی آفیسر نے دلدار پر چھڑیوں کی برسات کر دی۔ وہ ہر وار پر ہائے کرتا رہا۔

”میں کچھ نہیں جانتا سرکار!“ وہ مسلسل کہے جا رہا تھا۔

”جناب! اگر اجازت دیں تو کچھ عرض کروں؟“ ڈیوٹی آفیسر نے معنی خیز انداز میں انسپکٹر کا شان سے پوچھا۔

”ضرور، ضرور۔“ انھوں نے سر ہلایا۔

”جناب! جب میں خفیہ طریقے سے دلدار کے ٹھکانے پر پہنچا تو یہ موبائل پر اپنے باس سے بات کر رہا تھا۔ میں نے چپکے سے اس کی ساری گفتگو اپنے حساس وائس رکارڈر پر محفوظ بھی کر لی ہے۔“ ڈیوٹی آفیسر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے وائس رکارڈر کا بٹن دبایا۔

”دلادری صاحب!“ دلدار کی آواز ابھری: ”آپ فکر نہ کریں، کسی کو شک نہیں گزرے گا۔۔۔۔۔ بس آپ سپلائی میں کمی نہ آنے دیں۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔ میں سب کو سنبھال لوں گا، جی ظفر صاحب! آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے جناب! آپ کی جلد ترقی ہو جائے تو کار بار کا مزہ آ جائے۔“

انسپکٹر کا شان نے چپتے کی طرح اپنی کرسی سے چھلانگ لگائی اور دفتر کے دروازے کی طرف لپکے۔

ڈیوٹی آفیسر چلا یا: ”سر! بے فکر رہیں، میں ظفر دلادری پر پہلے ہی قابو پا چکا ہوں۔“ انسپکٹر کا شان فوراً مڑے، ان کی آنکھوں میں حیرت اور تحسین کے ملے جلے تاثرات جھلک رہے تھے۔

”معاف کیجیے گا سر! یہ سب کارروائی میں نے آپ کی اجازت کے بغیر ہی کر لی، مگر ظفر دلادری صاحب ہمارے سب انسپکٹر ہیں۔“

”بالکل غلط۔“ انسپکٹر کا شان مضبوط لہجے میں بولے: ”نہ وہ صاحب ہے، نہ سب انسپکٹر، وہ ایک مجرم ہے، قابل نفرت مجرم۔ اس کا جرم دہرا ہے، کیوں کہ اس نے قانون کی آڑ لے کر قانون شکنی کی ہے اور ہمیں دھوکا بھی دیا۔ وہ آستین کا سانپ ہے اور اس سانپ کا سر جتنی جلدی گھل دیا جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ ملزم کبیر کا علاج میں اپنی نگرانی میں کر اؤں گا۔“ ☆

آزادی

حکیم خاں حکیم

اپنا پاکستان ہے بچو! رب کا یہ احسان ہے بچو!
اپنی عزت، مان ہے بچو! آؤ! گھومیں وادی وادی

آؤ منائیں ہم آزادی

کھیتوں کی ہریالی دیکھو! پھولوں کی یہ لالی دیکھو!
شور مچاتا پانی دیکھو! آؤ! گھومیں وادی وادی

آؤ منائیں ہم آزادی

طائر گیت خوشی کے گائیں مست ہوا میں شور مچائیں
رب اپنا کہسار دکھائیں آؤ! گھومیں وادی وادی

آؤ منائیں ہم آزادی

جھنڈیوں سے ہر شہر سجا ہے سبز ہلالی خوب فضا ہے
چھتوں پر پرچم لہراتا ہے آؤ! گھومیں وادی وادی

آؤ منائیں ہم آزادی

علم در پیکے

زیادہ سے زیادہ مسئلہ کرنے کی عادت ڈالے اور اچھی اچھی مختصر تحریریں جو
آپ پڑھیں، وہ حصار نقل کر کے یا اس تحریر کی فوٹو کاپی ہمیں بھیج دیں،
مگر اپنے نام کے علاوہ اصل تحریر لکھنے والے کا نام بھی ضرور لکھیں۔

عشرہ مبشرہ

۷۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۸۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۹۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۱۰۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ

قائد اعظم کا طرز حکمرانی

مرسلہ: رضوان محمد خان، کراچی

قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنی کابینہ

کی پہلی میٹنگ بلائی۔ جب تمام وزرا

آچکے تو قائد اعظم کے اے ڈی سی جنرل

گل حسن نے ان کے پاس آ کر پوچھا:

”کیبنٹ میٹنگ میں وزرا کو چائے کے

ساتھ کیا کیا دینا ہے؟“

قائد اعظم نے حیرت سے پوچھا: ”کیا وہ

سب چائے اور کافی گھر سے پی کر نہیں آئے؟“

جنرل گل حسن چپ ہو گئے تو

مرسلہ: کبیرہ ادریس، کراچی

عربی زبان میں عشر کے معنی ”دس“

اور مبشرہ کے معنی ہیں ”جنہیں خوش خبری

سنائی گئی“ یعنی عشرہ مبشرہ سے مراد وہ دس

خوش نصیب صحابہ کرامؓ ہیں، جنہیں نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی زندگی ہی میں

جنت کی خوش خبری سنائی تھی۔ اُن کے نام

مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۲۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۳۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۴۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۵۔ حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

۶۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ

قائد اعظم نے ایک تاریخی جملہ کہا۔ انھوں نے فرمایا: ”وزرا سے کہہ دو، چاہے اور کافی گھر سے پی کر آئیں۔ میرے پاس قوم کا پیسہ قوم کی امانت ہے۔ اس پیسے کو وزرا کی عیاشیوں پر خرچ نہیں کیا جاسکتا۔“

گرمیوں کی چھٹیاں

مرسلہ : عریشہ فاطمہ، تارتھ کراچی

ہوگئی ہیں گرمیوں کی چھٹیاں
کیا مزہ، خالی اگر ہوں مٹھیاں
ہوم ورک اسکول والوں نے دیا
وہ تو جلدی جلدی ہم نے کر لیا
اب ملی فرصت تو آیا ہے خیال
جا رہے ہیں سیر کو خالو جمال
ملتی ہے سیر و سفر سے جو خوشی
اسی سے بڑھتا ہے ہمارا علم بھی

دوست بنائیے، صحت پائیے

مرسلہ : لیتیق احمد خاں، ناظم آباد

دوست بنانا آپ کی جسمانی صحت

کے لیے اچھا ہے اور اس کے فائدے چھوٹی عمر میں ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ محققین نے اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے چودہ ہزار افراد سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار جمع کیے۔ اس سے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک مختلف افراد کے ہیلتھ سرورے کیے گئے۔ انھوں نے ایک انڈیکس کے ذریعے سے سماجی رابطوں کی تعداد اور نوعیت، رشتے داروں، گھر والوں اور دوستوں سے تعلقات اور اس کے ساتھ ہی مذہبی اور سماجی تنظیموں کے اجتماعات میں شرکت کا جائزہ لیا۔ یہ ریسرچ، نیشنل اکیڈمی آف سائنس کی کارروائی پر مبنی تھی، جو کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

آزادی کی خوشی

مرسلہ : مباعبداللہ شریف، شکارپور

ایک بہت دبلا پتلا بھیڑیا سڑک کے کنارے جا رہا تھا۔ تین روز کی بھوک نے

اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ تھوڑی دور جا کر اسے ایک موٹا تازہ کتلا ملا۔ کتے نے بھیڑیے کو دیکھ کر کہا: ”کہو بھائی بھیڑیے! مزاج تو اچھا ہے؟ تم اس قدر دبلے کیوں نظر آتے ہو؟ کیا کچھ کھانے پینے کو نہیں ملتا؟“

بھیڑیے نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا: ”کیا کہوں بھائی! کچھ نہ پوچھو! جاں تم اپنی کہو، تمھاری تو خوب گزر رہی ہے، خوب موٹے تازے ہو رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے روزِ عمدہ عمدہ کھانوں پر ہاتھ مارتے ہو؟“
کتے نے جواب دیا: ”میں اپنے مالک کے گھر کی رکھوالی کرتا ہوں، اس لیے وہ کھانے کو بہت اچھا دیتا ہے۔ اگر تم بھی یہ کام کرنے لگو تو تم کو بھی کھانے پینے کی کچھ کمی نہ رہے گی۔“

کھانے کا نام سن کر بھیڑیے کی حالت میں جان آگئی۔ خوشی سے بولا: ”مجھے منظور ہے۔ مہربانی کر کے مجھے بھی ساتھ لے چلو۔“

کتے نے کہا: ”اچھا چلے آؤ۔“
اور بھیڑیا، کتے کے ساتھ ہولیا۔
چلتے چلتے بھیڑیے کو کتے کی گردن پر ایک گول سا نشان نظر آیا۔ اس نے کتے سے پوچھا: ”کیوں بھائی! تمھاری گردن پر یہ نشان کیسا ہے؟“

کتا بولا: ”یہ نشان اس پٹے کا ہے جو دن بھر میرے گلے میں پڑا رہتا ہے۔ دن کو مجھے زنجیر سے باندھ دیا جاتا ہے، مگر رات کو کھلا پھرتا ہوں۔ آؤ، سوچتے کیا ہو! اب گھر تھوڑی ہی دور رہ گیا ہے۔“

بھیڑیے نے کہا: ”نا بھائی! مجھے یہ کام پسند نہیں۔ میں آزادی کی خوشی کو بھوک کی تکلیف سے اچھا سمجھتا ہوں۔“

ڈھونگ

مرسلہ : عاقب فرید گھلو، ۱۸ ہزاری
کوئی دیہاتی ایک میلے میں گیا۔ وہاں اس کا جوتا چوری ہو گیا۔ واپسی پر گھر والوں

معلومات ہی معلومات

غلام حسین میمن

آب کوثر

آب کوثر — ج — جنت میں ایک نہر کا نام ہے۔ اس کا ذکر تیسویں پارے کی سورۃ کوثر میں آیا ہے کہ اس کا پیا پ — پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا۔ حوض عربی میں تالاب کو کہتے ہیں — ب —

”آب کوثر — ش —“ ایک کتاب کا نام بھی ہے۔ یہ کتاب شیخ محمد اکرام نے لکھی ہے۔ اس میں ہندستان کے مسلمانوں کی ثقافتی اور مذہبی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ تین حصوں میں لکھی ہوئی ہے۔ ہر حصے کا الگ — الگ نام ہے۔ اس سلسلے کے دوسرے حصے کا نام رود کوثر اور تیسرے کا نام موج کوثر ہے۔ ا — انھوں نے مرزا غالب اور مولانا شبلی نعمانی کی سوانح بھی لکھی ہے۔

اُردو

اُردو پاکستان — ب — بستان کی قومی زبان ہے۔ یہ چوں کہ مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے، اسی لیے اسے لشکری زبان — ب — بیاں کہا جاتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس کے لیے اتنا کام کیا کہ اُن کا لقب ہی باباے اُردو — ب — ہو گیا۔

قائد اعظم محمد — ب — محمد علی جناح نے مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ میں اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو — ب — ہوگی۔ ڈھاکہ اس وقت ہمارے ہی ملک کا ایک شہر تھا۔ اب یہ بنگلہ دیش کا دارالحکومت — ب — ہے۔

اُردو کے نام — ب — م سے ایک اخبار مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے ۱۸۳۸ء میں جاری کیے — کیا تھا۔ اس میں ملکی اور غیر ملکی واقعات کے علاوہ ذوق، غالب، مومن اور دوسرے شاعروں — ب — کی غزلیں بھی چھپتی تھیں۔ یہ اخبار ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک جاری رہا۔

☆ والدین کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھنا بھی عبادت ہے۔
☆ زیادہ قسمیں کھانے والا زیادہ جھوٹ بولتا ہے۔
☆ زیادہ چایا تھا۔“

اقوال زریں

مرسلہ : رد افاطمہ، گلشن اقبال

☆ کوئی آئینہ انسان کی اتنی اچھی تصویر پیش نہیں کر سکتا، جتنی اس کی گفتگو۔
☆ لوگوں کو دعا کے لیے کہنے سے زیادہ بہتر ہے، ایسے عمل کرو کہ لوگوں کے دل سے آپ کے لیے دعا نکلے۔
☆ لاکھوں کو دوست بنانا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات یہ ہے کہ ایک ایسا دوست بناؤ جو تمہارا اس وقت ساتھ دے، جب لاکھوں تمہارے خلاف ہوں۔
☆ کام یا بی حوصلوں سے ملتی ہے اور حوصلے دوستوں سے ملتے ہیں۔ دوست مقدروں سے ملتے ہیں اور مقدر انسان خود بناتا ہے۔
☆ اچھی کتاب بہترین دوست ہے۔

اک بات

شاعر : انور مسعود

پسند : مہک اکرم، لیاقت آباد
تجھ کو سیانا جان کے بھی اک بات تجھے سمجھانی ہے
ایسی بات کہ جس پر مجھ کو مدت سے حیرانی ہے
مجھ سے تو انگریزی بولے، تیری یہ نادانی ہے
میں پاکستانی ہوں اور تو بھی پاکستانی ہے
☆☆☆

☆☆☆

اُردو بازار (دہلی) لال قلعے سے جامع مسجد کے جنوبی دروازے تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں زیادہ تر کتب فروشوں کی دکانیں تھیں۔ اسی نسبت سے لاہور اور کراچی سمیت پاکستان کے کئی علاقوں میں کتابوں کے بڑے بازار کو اُردو بازار کہا جانے لگا۔

کالا باغ

ایک طویل عرصے سے ملک میں کالا باغ ڈیم کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ کالا باغ دراصل ضلع میانوالی کا ایک حصہ ہے۔ یہاں کالا باغ ڈیم بنانے کا منصوبہ زیر غور ہے۔ اس سے ہمارے ملک میں پانی کی کمی دور ہونے کے علاوہ بجلی کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ یہ دریائے سندھ کے دائیں کنارے واقع ہے۔ یہاں کونسل کی ایک کان اور سابق گورنر مغربی پاکستان (موجودہ پاکستان) ملک امیر محمد خان کا محل بھی ہے۔ کالا باغ کے نام سے ایک صحت افزا مقام ضلع ایبٹ آباد میں بھی ہے۔ انتہی گلی سے دو میل کے فاصلے پر واقع یہ علاقہ ایک بہترین تفریحی مقام ہے۔ یہ علاقہ فوجی چھاؤنی بھی ہے۔ جنگلات میں گھرا یہ علاقہ دل کش نظارہ پیش کرتا ہے۔

پہلا ناول

”مرآۃ العروس“ کو اُردو کا سب سے پہلا ناول مانا جاتا ہے۔ یہ ناول ڈپٹی نذیر احمد کا لکھا ہوا ہے۔ ناول کی کہانی دو بہنوں ”اصغری“ اور ”اکبری“ کے زندگی کے واقعات کے گرد گھومتی ہے۔ ناول میں سماجی اور معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس لیے یہ نصابی کتابوں میں شامل کیا گیا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو اُردو کا پہلا ناول نگار مانا جاتا ہے۔ انھیں ۱۸۹۰ء میں حکومت کی جانب سے ”شمس العلماء“ (علما کا سورج) کا خطاب بھی دیا گیا۔ انگریزی زبان کا پہلا ناول پامیلا (PAMELA) کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ۱۷۴۰ء میں لکھا گیا تھا۔ اسے سمویل رچرڈسن (SAMUEL RICHARDSON) نے تحریر کیا تھا،

جو ۱۶۸۹ء میں پیدا ہوا۔ ۱۱۶۱ھ ہوئے تھے۔ یہ ناول دراصل خطوط پر مشتمل ہے۔ سمویل رچرڈسن کا انتقال ۱۷۶۱ء میں ہوا۔ ۱۱۷۱ھ۔ وہ ایک پرنٹنگ پریس کے مالک تھے۔

گوبلز

جرمنی کا چانسلر جو: جوزف گوبلز (JOSEPH GOEBBLES) ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوا۔ وہ ہٹلر کا پروپیگنڈا وزیر تھا۔ ۱۹۴۱ء۔ اس کا کام ہٹلر کے نازی پیغام کو فروغ دینا تھا۔ ہٹلر کی خودکشی کے بعد اس نے بھی خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی مدح سرائی (تعریف) پر ہندو پریس نے زیڈ اے سلہری کو ”گوبلز آف جناح“ کا خطاب دیا تھا۔ زیڈ اے سلہری تحریک پاکستان کے رہنما اور پاکستان کے صحافی اور ٹائمز آف کراچی، ایوننگ ٹائمز، لاہور اور پاکستان ٹائمز کے مدیر ہیں۔ ۱۹۳۵ء سے انھیں قائد اعظم کے قتل کے قریب رہنے کا شرف حاصل رہا۔ انھوں نے قائد اعظم کی سوانح بھی لکھی جو ”MY LEADER“ کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے ۱۹۴۴ء میں دو قومی نظریہ کی تائید میں ”ہندو ڈیوٹی اینڈ اینڈ پاکستان“ نامی کتاب لکھی۔ ان کا انتقال ۲۱ اپریل ۱۹۹۹ء کو ہوا۔ ان کا مکمل نام ضیاء الدین ہے۔ ین احمد سلہری تھا۔

زیر اور پیش

گھٹکی (زیر کے) کے ساتھ) ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ڈر کی وجہ سے منھ سے گھٹی گھٹی کی آواز نکلتا۔ لٹھکتا۔ روتے روتے سانس رک کر آنے کی آواز۔ اسی لیے محاورہ ”گھٹکی بندھ جانا“ بولا جاتا ہے۔ خوف یا دہشت کے مارے سکتے کا عالم ہونا۔ گھٹکی (پیش کے) کے ساتھ) ہندی زبان کا لفظ ہے، جو فاختہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کا ایک اور مطلب بات باب بارش سے بچنے کے لیے کپڑے کی چادر کو اس طرح سر پر ڈالنا ہے کہ اس کی چونچ نیچی نظر آئے۔ آہ آئے۔

نصیحت

کرشن پرویز

علم کی شمع ہر اک دل میں جلانا بچو!

دل سے تاریک خیالوں کو مٹانا بچو!

کھا کے ٹھوکر جو گرے اس کو اٹھانا بچو!

پیار سے اس کو بھی سینے سے لگانا بچو!

سچ پہ اب جھوٹ کا پردہ ہے گراتی دنیا

تم حقیقت جو ہے ، دنیا کو بتانا بچو!

تم نہ شیطان کی باتوں میں کبھی بھول کے آنا

شمع ایمان کی ہر دل میں جلانا بچو!

تم نہ امداد کی پرویز توقع کرنا

اپنے ہاتھوں سے ہی تقدیر بنانا بچو!

آپ کا جسم اور خلیے

آپ کا جسم لاکھوں کروڑوں خلیوں یا سیل (CELL) سے مل کر بنا ہے۔ یہ خلیے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ وہ ایک اچھی خوردبین کے بغیر نہیں دیکھے جاسکتے۔ آپ کے جسم کا کوئی بھی حصہ ان سے خالی نہیں۔ آپ کی ہڈیاں، آپ کی کھال، آپ کا دل، آپ کے پھیپڑے، آپ کے ہنڈے، غرض آپ کا ہر عضو خلیوں سے ہی مل کر بنا ہے۔

آپ کی طرح آپ کے خلیے بھی زندہ ہیں اور زندہ رہنے کے لیے انھیں بھی آپ کی طرح بھوک لگتی ہے۔ آپ جو غذا کھاتے ہیں، اسی سے ان خلیوں کو بھی حصہ ملتا ہے۔ وہ غذا جذب کر کے بڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی خلیہ بڑا ہوتا ہے، وہ خود بخود دو خلیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اب میں ہر خلیہ اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے۔

ایک خلیے کی بہ نسبت دو خلیے زیادہ جگہ گھیرتے ہیں اور چار خلیوں کو دو خلیوں کے مقابلے میں زیادہ جگہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی لیے آپ کے ہاتھ، آپ کی ٹانگیں غرض پورا جسم بڑا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور آپ بچے سے بڑے ہو کر پورے انسان بن جاتے ہیں۔ خلیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہی آپ کے قد و قامت میں اضافہ کرتی ہے۔ پہلے آپ کے ہاتھ پیر پتلے تھے، اب وہ موٹے ہوئے۔ چلے جاتے ہیں۔ اگر بچہ تندرست ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا جسم نہ بڑھے۔ خلیوں کو ایک کا اور بھی کرنا پڑتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی میں کچھ خلیے مرتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کے بچپن میں یہ عمل سست رہتا ہے یعنی زیادہ خلیے نہیں مرتے۔ لیکن جیسے جیسے انسان کی عمر زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے، اس عمل میں تیزی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، یعنی زیادہ خلیے مرتے ہیں۔ اسی کا نام بڑھاپا ہے۔

جب بچہ سڑا ہو کر بالغ ہو جاتا ہے تو نئے خلیے پرانے خلیوں کی جگہ تولیتے رہتے ہیں، لیکن جسم میں مزید اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ قدرت کا نظام ہے کہ آپ کا قد و قامت ایک جگہ آ کر رک جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور انسان برابر بڑھتا رہتا تو اس وقت دنیا میں انسانوں کے بجائے دیوبھرے ہوتے! ☆

یہ پاکستان ہے پیارے

سید سخاوت علی جوہر

جو سب کی آن، سب کی شان، سب کی جان ہے پیارے
وہ سب کی عزت و حرمت کا نگہبان ہے پیارے
جہاں میں اس کے دم سے سب ہی کی پہچان ہے پیارے

یہ پاکستان ہے پیارے، یہ پاکستان ہے پیارے
زمین پہ جس کی ہر سو چاند تارے جگمگاتے ہیں
یہ وہ دھرتی ہے جس کے ذرے ذرے مسکراتے ہیں
جاں دینے کو تیار ہر اک جوان ہے پیارے

یہ پاکستان ہے پیارے، یہ پاکستان ہے پیارے
بہی ہے ایسی خوشبو کی مہک اس کی فضاؤں میں
نظارے ہی نظارے ہیں پہاڑوں، کھٹھاؤں میں
ہر اک کی اب زباں پہ آج یہ ہی تان ہے پیارے

یہ پاکستان ہے پیارے، یہ پاکستان ہے پیارے
سندھی، بلوچی ہو کہ پنجابی ہو یا پٹھان
اُس کا وزیر ہو یا گورنر ہو یا دہقان
دھرتی پہ اس کے سب کو ملی امان ہے پیارے

یہ پاکستان ہے پیارے، یہ پاکستان ہے پیارے
تحفظ اس کو دیتے ہیں، جو فوجی جنگ کے ماہر ہیں
شکستِ فاش دینے کے بھرے سب ان میں جو ہر ہیں
وہ سب ہیں تیر اس کے اور یہ کمان ہے پیارے

یہ پاکستان ہے پیارے، یہ پاکستان ہے پیارے

نوناہل خبرنامہ

سلیم فرخی

مچھر سے پاک دنیا کا واحد ملک

دنیا میں انسان کو بے حد تکلیفیں اور پریشانیاں
لا رہی ہیں۔ ان میں ایک مچھروں کا عذاب بھی
ہے۔ مچھر دنیا میں ہر جگہ پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ یہ
ریگستان میں بھی ہوتا ہے۔ صرف آئس لینڈ ایسا ملک
ہے، جہاں ایک بھی مچھر نہیں ہے۔ وہاں کے لوگ
مچھروں کو صرف تصویروں اور فلموں ہی میں دیکھتے
ہیں۔ یہاں مچھر کی غیر موجودگی کے بارے میں مختلف



خیالات پائے جاتے ہیں۔ کچھ ماہرین کہتے ہیں کہ اس کی
میں تین بار نیند ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آئس لینڈ کی مٹی اور ماحول کی مخصوص کیمیائی ساخت ہے،
جس کی وجہ سے مچھر کی نشوونما یہاں ممکن نہیں ہے۔

آٹھ سالہ لمبا بچہ

اگر کسی بچے کا قد اس کی عمر کے تناسب
سے نہیں بڑھ رہا ہو تو والدین پریشان
ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ اس کے برعکس بھی
ہوتا ہے۔ بھارت کے شہر میرٹھ کا ایک آٹھ
سالہ بچہ "کرن" تیزی سے لمبا ہو رہا ہے۔



اس وقت اس کا قد چھ فٹ چھ انچ ہے۔ انسان کا قد عموماً ۳-۴ سال تک بڑھتا رہتا ہے۔ اس بچے کی والدہ
"شو-تھلینا" بھارت کی سب سے طویل القامت خاتون ہیں، جن کا قد سات فٹ دو انچ ہے۔ لگتا ہے، کرن
بڑے ہو کر اپنی ماں کا نام روشن کرے گا۔ کرن باسکٹ بال شوق سے کھیلتا ہے۔ کرن اور اس کی والدہ کے لیے تیار
شدہ کپڑے نہیں ملتے، درزی سے خصوصی طور پر سلوانے پڑتے ہیں۔

بلا عنوان انعامی کہانی

حسن ذکی کاظمی



چینی کے برتن بنانے والی مشہور کمپنی علی سز کے مینجنگ ڈائریکٹر شیخ مبارک علی اپنے دفتر میں بیٹھے ضروری فائل دیکھنے میں مصروف تھے کہ سیکرٹری نے کسی ملاقاتی کے آنے کی اطلاع دی۔ شیخ صاحب نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا: ”ٹھیک ہے، ابھی میرے جانے میں آدھا گھنٹا ہے، انھیں اندر لے آئیے۔“

ملاقات کے لیے آنے والے صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو شیخ صاحب نے چند سیکنڈ تک غور سے انھیں دیکھا اور ہاتھ ملانے کے بعد ان کی خیریت پوچھی۔ وہ صاحب سامنے والے کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ شیخ صاحب بولے: ”بھئی، اس بار تو کافی دن کے بعد



ملاقات ہو رہی ہے۔ کیا بہت مصروف رہے؟“
 جواب ملا: ”شیخ صاحب! کار بار میں مصروفیت تو رہتی ہی ہے، لیکن دراصل وہ.....“
 شیخ صاحب نے بات کاٹی اور کہنے لگے: ”نہیں صاحب! یہ کارباری مصروفیت کا
 بہانہ نہیں چلے گا۔ بھئی، ملتے رہا کیجیے۔ اچھا یہ بتائیے، فیکٹری کیسی چل رہی ہے؟“
 ملاقات کے لیے آنے والے صاحب ذرا گھبرا کر بولے: ”شیخ صاحب! غالباً
 آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری اور آپ کی تو یہ پہلی ملاقات ہے۔“
 ملاقاتی کی اس بات پر شیخ صاحب کھسیانی نہی بنے اور کہنے لگے: ”اچھا تو یہ ہماری
 آپ کی پہلی ملاقات ہے۔ یعنی ہم کبھی ملے ہی نہیں، بہت خوب!“
 آنے والے صاحب دوبارہ بولے: ”میں میلیسیم ہوٹل کا منیجر ہوں۔ فرید احمد نام



صحت مند ہے، بھلا چنگا - کیسا علاج اور کیسا امریکا؟“

یہ کہہ کر ان صاحب نے سلام کیا، ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ شیخ صاحب کی باتوں سے ان کا موڈ خاصا بگڑ گیا تھا اور وہ یہ بھی نہیں بتانا چاہتے تھے کہ وہ کون ہیں۔ ادھر شیخ صاحب بڑبڑاتے ہوئے اپنی کار کی طرف چلے۔

”ایک بھائی ہو یا دس - ہمیں کیا دے دیں گے۔ عجب زمانہ آ گیا ہے۔ لوگ ہماری کو بھی چھپاتے ہیں۔ ارے بھئی، سچی بات بتا دیں تو صحت کے لیے دعا ہی کریں گے، لیکن وہ تو کہتے ہیں کہ بھلا چنگا ہے۔ چلو، اللہ بھلا چنگا ہی رکھے۔“ پھر شیخ صاحب نے ارادیر سر کھجایا اور خود ہی خود کہنے لگے: ”اگر یہ سرور صاحب نہیں تھے تو پھر کون تھے! خیر اوں گے کوئی، ہمیں کیا۔ اللہ ان کا بھلا کرے۔“

چند دن بعد شیخ صاحب دفتر سے گھر پہنچے تو دیکھا کہ باہر والے برآمدے میں کوئی صاحب

ہے میرا۔ آپ سے آج صبح فون پر بات ہوئی تھی۔ ہمیں اپنے سنے ہوٹل کے لیے چینی کے برتن خریدنے ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنے کسی ایسے کارکن سے ملوادیں جو مجھے کیٹلاگ دکھاسکے اور ضروری معلومات دے سکے تو میں شکر گزار ہوں گا۔“

شیخ مبارک علی نے فرید احمد کو اپنے بیٹے ندیم کے پاس بھیجا اور خود تھوڑی دیر بعد کار میں بیٹھ کر میٹنگ کے لیے روانہ ہو گئے۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد وہ ہوٹل سے باہر نکل کر کار کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ذرا دور سے آواز آئی: ”شیخ صاحب السلام علیکم! ارے جناب! کیا بہت جلدی میں ہیں؟“

شیخ صاحب نے مڑ کر دیکھا اور ٹھہر گئے۔ پھر آواز دینے والے صاحب کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے: ”ارے میاں! جلدی کتنی ہی کیوں نہ ہو، لیکن آپ سے ملے بنا کیسے جاسکتے ہیں۔ بھئی، آخر آپ کے شہر میں رہنا ہے۔“ یہ کہہ کر شیخ صاحب ہنسے اور پھر کہنے لگے: ”اور سنائیے، آپ کے بھائی صاحبان کیسے ہیں؟“

وہ صاحب بولے: ”جی بھائی صاحبان تو نہیں، میرا تو بس ایک چھوٹا بھائی ہے۔“ شیخ صاحب جلدی سے بولے: ”جی ہاں، جی ہاں، بھلا انھیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ اچھا وہ امریکا سے واپس آ گئے یا ابھی وہیں کی سیر.....“

ان صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا: ”نہیں، معین تو یہیں ہے۔ وہ تو امریکا گیا ہی نہیں۔“

شیخ صاحب نے بڑے اطمینان سے کہا: ”اچھا بہت خوب! تو گویا یہیں علاج کر رہے ہیں؟“

جواب ملا: ”ارے صاحب! اللہ تعالیٰ اسے سلامت رکھے۔ وہ تو ماشاء اللہ بالکل

بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ شیخ صاحب کو انھوں نے بڑے ادب سے سلام کیا اور خیریت پوچھی۔ شیخ صاحب نے بھی بڑی محبت سے جواب دیا اور پاس والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ خیر و عافیت کے بعد شیخ صاحب کہنے لگے: ”آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں نواب زادہ صاحب! چلیے، اندر ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے۔ آپ نے تکلیف کی۔ مجھے فون کر دیتے، میں آ جاتا۔“

وہ صاحب بولے: ”شیخ صاحب! آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں کہاں کا نواب زادہ۔ اس گزارے کے لیے تھوڑی بہت زمین ہے۔ اللہ کا کرم ہے۔ دراصل میں تو اس وقت.....“ شیخ صاحب نے ان کی بات سنی اُن سنی کی اور پیچ میں بول اُٹھے: ”ارے صاحب! امیں تو معلوم ہے کہ آپ خاندانی نواب ہیں۔ آپ کی عنایت ہے کہ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے۔ یقین جانے میرا تو یہ حال ہے کہ:

وہ آئیں گھر ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہائے، مجھے تو وہ زمانہ یاد ہے جب آپ اپنے والد مرحوم کی انگلی پکڑے.....“

وہ صاحب تو جیسے اُچھل پڑے اور جلدی سے بولے: ”نہیں، شیخ صاحب! آپ کو کسی نے غلط بتایا میرے والد مرحوم..... لاحول ولاقوة..... میرا مطلب ہے میرے والد بزرگوار تو اللہ کے فضل سے زندہ ہیں۔ اللہ ان کا سایہ ہمارے سر پر قائم رکھے۔ دراصل انھوں نے ہی تو مجھے آپ کے صاحبزادے ندیم صاحب کے پاس بھیجا ہے۔“ شیخ صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بوکھلا گئے۔ کہنے لگے: ”بہت خوب! بہت خوب، تو ابھی تک زندہ ہیں۔ ہاں صاحب، کیوں نہیں۔ والدین کا سایہ تو اللہ کی رحمت ہے۔ اللہ انھیں زندگی دے۔“

یہ کہہ کر شیخ صاحب کچھ شرمندہ شرمندہ اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے جانا ہی چاہتے تھے کہ ندیم باہر نکل آیا۔ آنے والے صاحب سے سلام علیک کے بعد اس نے شیخ صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔

”ابامیاں! یہ سلمان ہیں۔ کیمبل پور والے آغا صاحب کے بیٹے۔ یہ ایک کنٹریکٹ کے سلسلے میں آئے ہیں۔ ان سے ذرا بات کر لوں۔ کل آپ کو بتاؤں گا۔ سلمان! معاف کرنا۔ میں دفتر سے آنے کے بعد نہار ہاتھا۔ باہر آنے میں دیر ہوگئی، چلو، اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“

شیخ صاحب نے شرمندگی پر قابو پاتے ہوئے کہا: ”سلمان میاں! یہ بتاؤ، آغا صاحب کیسے ہیں؟ کبھی ہمیں بھی یاد کرتے ہیں؟“

سلمان سے دو چار باتیں کر کے اور آغا صاحب کو سلام پہنچانے کی تاکید کر کے شیخ صاحب تو اندر چلے گئے اور ندیم، سلمان کو ڈرائنگ روم میں لے کر جانے کے بجائے لان میں جا بیٹھا۔ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ کار بار کی بات ختم ہوئی تو خاندان اور پرانے دوستوں کا ذکر شروع ہوا۔ اچانک سلمان کہنے لگا: ”شیخ صاحب نے مجھے پہچانا نہیں، حال آنکہ ابھی سال بھر پہلے ملاقات ہوئی تھی!“

ندیم نے گردن ہلاتے ہوئے کہا: ”ہاں، یہ بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ تمہیں تو سال بعد دیکھا ہے۔ وہ تو اب چند مہینے، بلکہ اکثر تو چند ہفتے پہلے کی ملاقات بھی بھول جاتے ہیں اور چہرے بھی ان کے ذہن میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ تمہیں نہیں پہچانے ہوں گے، اسی لیے تو میں نے تمہارا تعارف کرایا تھا۔“

سلمان نے کچھ پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ”یہ تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا تو لوگوں کے لیے.....“

ندیم نے بڑی اداسی سے کہا: ”ہو جائے گا نہیں، ہو گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر ابامیاں کی یادداشت یوں ہی خراب ہوتی رہی تو خود ان کے لیے اور خاندان والوں کے لیے بے حد مشکل ہو جائے گی۔ ادھر کار بار پر بھی اس کا بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ ہر شخص تو یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ ایک بیماری ہے۔ بعض لوگ بُرا مان جاتے ہیں کہ انہیں ابامیاں نے پہچانا نہیں۔ انہیں بار بار تعارف کرانا پڑتا ہے۔ کبھی کوئی بات انہیں بُری لگ جاتی ہے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ کار بار سے علاحدہ ہو کر گھر پر بیٹھ رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی صحت پر اس کا اور بھی بُرا اثر پڑے۔ دوسری بات یہ کہ مجھے ان کی رائے مشورے کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ ان کا دفتر میں بیٹھا رہنا ہی بہت ہے۔“

سلمان، ندیم کی باتیں بہت غور سے سنتا اور سر ہلاتا رہا۔ ندیم نے بات پوری کی تو وہ بولا: ”اللہ مالک ہے، گھبراؤ نہیں۔ آج کل سائنس کی ترقی نے ہر مسئلے کا حل بتا دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک رپورٹ برطانیہ میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے اخبار میں یہ رپورٹ پڑھی تھی۔ اس وقت میں لندن میں تھا۔ میں نے اخبار کا تراشہ بھی رکھ لیا تھا۔ تلاش کرنا پڑے گا۔ مل گیا تو ٹھیک ہے، ورنہ انٹرنیٹ سے مدد لوں گا یا پھر کسی سے فون پر لندن بات کروں گا اس کے بارے میں۔ میں تمہیں تفصیل سے ہفتے وں دن میں بتاؤں گا۔“

سلمان تو کیمبل پور روانہ ہو گیا، لیکن ندیم نے اسی دن سے کوشش کرنی شروع کر دی کہ اسے اپنے والد کے علاج کے لیے جلد از جلد معلومات حاصل ہوں، لیکن اس نے شیخ صاحب کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔ البتہ یہ احتیاط شروع کر دی کہ ملاقات کے لیے آنے والوں کو وہ کسی نہ کسی بہانے سے اپنے ہی کمرے میں بلاتا اور شیخ صاحب کے پاس صرف ضروری کاغذات اور فائلیں بھیجتا۔

ایک دن ندیم اپنے کمرے میں بیٹھا کسی مہمان سے باتیں کر رہا تھا کہ شیخ صاحب

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے اور کہنے لگے: ”اچھا ندیم بیٹے! میں کلب جا رہا ہوں اور وہاں سے گھر چلا جاؤں گا۔ تم کام کا خیال رکھنا۔“

ندیم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا: ”جی بہتر ہے۔“

مہمان بھی کھڑے ہو گئے اور شیخ صاحب کو سلام کر کے ان سے ہاتھ ملایا۔ ندیم ان کا تعارف کرانے لگا تو شیخ صاحب نے بات کاٹ دی: ”ہاں ہاں، میں خوب واقف ہوں۔ آپ سے تو ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ ابھی عید کے موقع پر تو ملے تھے، کیوں جناب! میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

مہمان نے جواب دیا: ”جی ہاں! بالکل درست فرما رہے ہیں آپ۔ عید کے دن ملاقات ہوئی تھی۔“

شیخ صاحب نے ندیم اور مہمان سے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ پھر چند لمحے بعد بولے: ”بھئی، بہت اچھی تقریب رہی۔ کافی لوگ آ گئے تھے۔ کھانا بھی اچھا تھا اور تفریحی پروگرام بھی بہت اچھا رہا۔“

مہمان نے کہا: ”جی ہاں، کلب کی تقریب ہمیشہ بہت اچھی رہتی ہے۔ دراصل پروگرام کافی محنت اور توجہ سے تیار کیا جاتا ہے۔“

شیخ صاحب نے دو چار باتیں اور کیں اور چلے گئے۔ ندیم کو کچھ حیرت بھی تھی اور خوشی بھی کہ شیخ صاحب نے مہمان کو پہچان لیا۔ اس کو خیال ہوا کہ چہروں کو بھول جانے کی جو بیماری شیخ صاحب کو ہو گئی تھی، اس میں افاقہ ہو رہا ہے۔

رات کو گھر کے سب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے کھانا کھانے اور باتوں میں مصروف تھے کہ شیخ صاحب نے بیٹے سے پوچھا: ”بھئی ندیم میاں! تمہارے وہ دوست جو آج دفتر

میں ملے تھے، باقاعدہ گاتے ہیں یا شوقیہ فنکار ہیں۔“

ندیم نے ہنس کر کہا: ”ابامیاں! کس کی بات کر رہے ہیں! وہ سلیم ہے۔ اس کی آواز پھٹے بانس سے بھی گئی گزری ہے۔ وہ کیا گائے گا؟“

شیخ صاحب حیران ہو کر بولے: ”اچھا! میں شاید بھول گیا۔ ہاں یاد آیا، یہ سلیم صاحب دوست تھے جو اپنے ہیٹ سے کبوتر نکال رہے تھے اور جنھوں نے ڈبے میں ایک رومال ڈال کر اس رومال نکالے تھے۔ بھئی، اپنے کمالات سے انھوں نے بچوں کو تو حیران کر دیا تھا۔“

”ابامیاں! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ سلیم تو بجلی کے سامان کا کار بار کرتا ہے اور اس کا دفتر ہمارے دفتر کے قریب ہے۔ نہ وہ گاتا ہے اور نہ کرتب دکھاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ عید والی تقریب میں موجود تھا اور آپ سے ملاقات بھی ہوئی تھی، بلکہ وہ آپ سے باتیں بھی کر رہا تھا۔“

ندیم بے شیخ صاحب کو یاد دلایا اور سوچنے لگا: بڑا اچھا ہوا کہ ابامیاں نے یہ باتیں سلیم کے منہ پر نہیں کہہ دیں، ورنہ بڑی شرمندگی ہوتی۔

ندیم نے شیخ صاحب کے بارے میں ملک کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ ان کے علاج سے شیخ صاحب کی یادداشت ٹھیک نہیں ہوئی تو اور خراب بھی نہیں ہوئی۔ ویسے ہی شیخ صاحب کی یادداشت ہر لحاظ سے ٹھیک ہی تھی، سوائے اس کے کہ وہ لوگوں کے چہرے اور نام بھول جاتے تھے۔ بہر حال علاج معالجے سے شیخ صاحب پر کچھ نہ کچھ اچھا اثر ضرور پڑا تھا۔ اس دوران میں ندیم کا دوست سلمان بھی وہ باتیں معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا، انھیں معلوم کرنے کی وہ کوشش کر رہا تھا۔ اچانک سلمان کو اپنے کار بار کے سلسلے میں امریکا جانا پڑا۔ وہاں سے لوٹا تو وہ شیخ صاحب کے لیے ایک تحفہ لایا، جو اس نے ندیم کو دے دیا۔

رات کو کھانے کے بعد باپ بیٹے میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ندیم، شیخ صاحب کو کچھ سمجھاتا رہا اور بار بار کوئی چیز دکھاتا رہا۔ آخر میں شیخ صاحب نے کہا: ”اچھا بھئی، میں چلا۔ بڑے زور کی نیند آ رہی ہے۔ تم کہتے ہو تو کل سے یہ تجربہ بھی کر دیکھتے ہیں۔ حرج ہی کیا ہے؟“

دوسرے دن سے تجربہ شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اندازہ ہوا کہ تجربہ کافی کامیاب ہو رہا ہے۔ شیخ صاحب ایک دن اپنے ایک دوست کے ساتھ کلب میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ سامنے سے ایک صاحب گزرے، جنھوں نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں سلام کیا۔ شیخ صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے انھیں غور سے دیکھا اور گرم جوشی سے کہا: ”ارے بھئی فرید احمد صاحب! کیا حال ہیں؟ خیریت تو ہے؟“

فرید احمد نے قریب آ کر کہا: ”آپ کی دعا ہے شیخ صاحب! اللہ کا بڑا کرم ہے۔“ شیخ صاحب نے انھیں کرسی پیش کرتے ہوئے بیٹھے کو کہا اور بولے: ”اور میاں میلیسیم ہوٹل کی سنا ئی، کیسا چل رہا ہے؟“

فرید احمد نے بیٹھے ہوئے کہا: ”شیخ صاحب! مقابلہ سخت ہے، لیکن میں مطمئن ہوں۔ کام فرسٹ کلاس جا رہا ہے۔ آپ دعا کرتے رہیے اور ہاں شیخ صاحب! مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ آپ نے آج مجھے پہچان لیا۔ نام بھی یاد رکھا اور میرا کام بھی ورنہ پچھلی تین ملاقاتوں میں تو ہر بار تعارف کرانا پڑتا تھا۔“

شیخ صاحب نے بات ٹالنے کے لیے قہقہہ لگایا اور بولے: ”بھئی فرید میاں چارے نام بھول جاؤں تمھارا، لیکن کام نہیں بھولوں گا، یعنی یہ کہ آپ ہوٹل کے منیجر ہیں میں تو گھر والوں سمیت دعوت کھانے آنے والا ہوں آپ کے ہاں۔“

فرید احمد بولے: ”ضرور آئیے، ضرور آئیے، ہماری خوش قسمتی ہوگی۔“

یہ کہہ کر فرید احمد تو ہنستے ہوئے چل دیے، لیکن شیخ صاحب کے دوست ان کے پیچھے پڑ گئے: ”بھئی! یقین جانو میں تو ڈرنے لگا تھا کہ کسی دن میں ملنے آؤں اور تم پوچھنے لگو کہ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو؟ چلو، اوروں کو نہ سہی مجھے تو بتاؤ کہ یہ معجزہ کیا ہوا؟ میں کسی کو بتانے تھوڑی جا رہا ہوں۔“

شیخ صاحب نے دیکھا کہ ان کے دوست جانے بغیر نہیں مانیں گے تو کہنے لگے: ”بھائی! مختصر بات کروں گا۔ امریکا کے ایک سائنسی ادارے نے جو ”میاں چوسٹس“ میں کام کر رہا تھا، ایک ایسا ننھا سا کیمرا بنانے کا منصوبہ بنایا، جسے آسانی سے جیکٹ یا کوٹ کے کارلر میں یا قمیص کے جیب کے اوپر لگایا جاسکے اور یہ کمپیوٹر انڈز ہو۔ سائنس داں اس کیمرے سے یہ کام لینا چاہتے تھے کہ جب کوئی شخص اس آدمی سے ملنے آئے، جس کے لباس پر یہ کیمرا نصب ہے تو اس آدمی کی شکل، ملاقات کی جگہ اور ایک دو خاص باتیں کیمرے کے کمپیوٹر میں محفوظ ہو جائیں۔ جب بھی اس آدمی کی اس شخص سے اگلی ملاقات ہو، کمپیوٹر اپنا سارا کارڈ چند سیکنڈ میں کھگال ڈالے اور اس آدمی کے کان میں گئے ہوئے ایک آلے کے ذریعے سے اسے بتائے کہ یہ فلاں شخص ہے، فلاں جگہ ملا تھا، فلاں کام کرتا ہے۔ پھر اس بات کا امکان ہے کہ اس آدمی کو اس شخص کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی یاد آ جائیں اور اگر کچھ اور باتیں نہ بھی یاد آئیں تو کم از کم اس کا نام اور پچھلی ملاقات کی جگہ تو معلوم ہو ہی جائے گی۔ دیکھو یہ کیمرا ہے، جو بن کی طرح میرے کارلر میں لگا ہے اور یہ بالکل چھوٹا سا آلہ کان کا ہے۔ ان دونوں کا آپس میں تعلق ہے۔ یہ منصوبہ بہت پہلے بننا تھا، لیکن یہ کیمرا پچھلے سال بنا اور اس کا تجربہ ہو رہا ہے۔ اللہ بھلا کرے آغا صاحب کے بیٹے سلمان کا، جس نے میری مدد کی۔“

شیخ صاحب کے دوست حیران ہو کر ننھے سے کیمرے کو دیکھتے رہے اور بولے: ”شیخ صاحب!



نئے مزاح نگار

منی گھر



😊 کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ اسٹیڈیم کے دروازے میں ان کا کوئی پرانا واقف کار مل گیا۔ سلام پر پاس دکھا کر ایک لڑکا اندر جانے لگا تو گیٹ کپرنے کہا: ”یہ تمہارا پاس تو نہیں ہے۔“
”یہ میرے والد صاحب کا ہے۔“
”وہ کیوں نہیں آئے؟“
”وہ بہت مصروف ہیں۔“
”کیا کر رہے ہیں؟“
”اپنا پاس ڈھونڈ رہے ہیں۔“
- **مرسلہ:** حامد قمر، ملتان

😊 ایک آدمی اخبار پڑھ کر رو رہا تھا۔ دوسرے شخص نے پوچھا: ”کیا اخبار میں کوئی بُری خبر چھپی ہے، جو اس طرح رو رہے ہو۔“
پہلا شخص نے جواب دیا: ”اخبار میں ایک مضمون چھپا ہے، جس کا عنوان ہے، رونے کے فائدے۔“
- **مرسلہ:** حسین علی، جعفر آباد

😊 ایک صاحب کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک صاحب نے ان سے کہا: ”یہ تمہارا پاس تو نہیں ہے۔“
”یہ میرے والد صاحب کا ہے۔“
”وہ کیوں نہیں آئے؟“
”وہ بہت مصروف ہیں۔“
”کیا کر رہے ہیں؟“
”اپنا پاس ڈھونڈ رہے ہیں۔“
- **مرسلہ:** حامد قمر، ملتان

میرا خیال ہے اس کیمرے سے تو اور بھی بہت سے کام لیے جاسکتے ہیں، جاسوسی واسوسی کے۔“
شیخ صاحب نے کہا: ”ہاں، یہ تو ابتدا ہے۔ ظاہر ہے اسے بہتر بنایا جائے گا۔ میرے ساتھ تو یہ ہوا کہ تیسری ملاقات تک تو میں فرید احمد کو نہیں پہچانا، کیوں کہ یہ کیمرا نہیں آیا تھا، لیکن اس تیسری ملاقات میں ان کی شکل اور آتا پتا کیمرے نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا۔ اب آج جو چوتھی ملاقات ہوئی تو ان کے سامنے آتے ہی اس آلے نے ساری بات مجھے یاد دلادی۔“
دوست مسکرائے اور کہنے لگے: ”کیا زمانہ آ گیا ہے، یعنی ہم کمپیوٹر کی یادداشت کے محتاج ہو گئے، لیکن بھائی! اللہ کے واسطے بھابی، بچوں اور ہم جیسے دوستوں کو تو کمپیوٹر کی مدد سے نہ پہچانا۔ اپنی یادداشت سے ہی پہچان لینا، کیوں کہ کیمرا صورت تو پہچان لے گا، لیکن اس کا دل سے تو کوئی تعلق نہیں ہوگا، صرف ایک مشینی تعلق رہ جائے گا۔“
شیخ صاحب کھڑے ہوتے ہوئے بولے: ”بھائی! کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کیا کیا ہوگا۔ یہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ کون جانے ایک دن ہمارا سارا دماغ ہی کمپیوٹر انڈو ہو جائے، ہم سب چلتی پھرتی مشینیں بن جائیں اور محبت کے رشتے ختم ہو جائیں۔“

اس بلا عنوان انعامی کہانی کا اچھا سا عنوان سوچیے اور صفحہ ۸۵ پر دیے ہوئے کوپن پر کہانی کا عنوان، اپنا نام اور پتا صاف صاف لکھ کر ہمیں ۱۸- اگست ۲۰۱۷ء تک بھیج دیجیے۔ کوپن کو ایک کاپی ساز کاغذ پر چپکا دیں۔ اس کاغذ پر کچھ اور نہ لکھیں۔ اچھے عنوانات لکھنے والے تین نوںہالوں کو انعام کے طور پر کتابیں دی جائیں گی۔ نوںہال اپنا نام پتا کوپن کے علاوہ بھی علاحدہ کاغذ پر صاف صاف لکھ کر بھیجیں تاکہ ان کو انعامی کتابیں جلد روانہ کی جاسکیں۔

نوٹ: ادارہ ہمدرد کے ملازمین اور کارکنان انعام کے حق دار نہیں ہوں گے۔

☺ دروازے پر دستک ہوئی۔ صاحب باہر آئے تو دیکھا کہ دھوبی کھڑا ہے۔ دھوبی نے کہا: ”یہ سوکانوٹ آپ کے کپڑوں میں تھا۔“
”تم رکھ لو، یہ جعلی ہے۔“
”اسی لیے تو واپس کرنے آیا ہوں۔“

مرسلہ: ماہ نور اشعر، دغیر
☺ ایک پولیس والے نے ملزم سے کہا: ”تمہیں معلوم ہے کہ اگر تم جھوٹ بولو گے تو کہاں جانا ہوگا؟“
ملزم نے جواب دیا: ”جی ہاں، معلوم ہے، دوزخ میں جانا ہوگا۔“
پولیس افسر نے کہا: ”اگر سچ بولو گے تو؟“
ملزم نے کہا: ”جناب! جیل میں۔“

مرسلہ: روبینہ ناز، کراچی
☺ ایک غریب شخص اپنے مکان کا کرایہ نہیں دیتا تھا۔
مالک مکان: ”میں صرف چار دن کی مہلت دیتا ہوں اور ان چار دنوں میں تمہیں میرا مکان خالی کرنا ہوگا۔“
دے دیجیے گا۔“

مرسلہ: محمد احمد غزنوی، ریحان پور شریف
☺ بیوی شوہر سے بولی: ”میں پڑوس میں جا رہی ہوں۔ دس منٹ بعد ہانڈی چولھے سے اُتار لیں اور ایک گھنٹے بعد منے کو فیڈر دے دیجیے گا۔“

شوہر: ”ٹھیک ہے، لیکن تم کب تک آؤ گی؟“
بیوی: ”بس میں پانچ منٹ میں آئی۔“

مرسلہ: محمد ارسلان رضا، کھر وڑپکا
☺ استاد نے گھر پر کام کرنے کے لیے دیتے ہوئے کہا: ”سستی کیا ہے، اس پر ہر لاکا تین جملے لکھ لائے۔“

دوسرے دن استاد نے ایک کاپی اٹھائی۔ اس میں پہلی سطر میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ دوسری میں بھی کچھ نہیں تھا۔ تیسری سطر میں لکھا تھا: ”یہ ہے سستی۔“

مرسلہ: محمد جاد ملک، حیدر آباد
☺ دونشے باز چھت پر سو رہے تھے۔ بارش شروع ہوئی۔ پہلا: ”اُٹھو، اندر چلو، آسمان میں سوراخ ہو گیا ہے۔“
بجلی چمکی تو دوسرا بولا: ”چلو سو جاؤ، ایڈنگ والے بھی آگئے ہیں۔“

مرسلہ: اریہد افروز، بفرزون
☺ ڈاکو، مسافر سے: ”رقم دو گے یا جان؟“

مسافر: ”جان لے لو، رقم میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔“

مرسلہ: حافظ وقاص روح، صادق آباد
☺ ایک بے وقوف نے دوسرے بے وقوف سے کہا: ”ایک چیونٹی اور چھٹی موٹر سائیکل پر سیر کو جا رہے تھے۔“
چیونٹی موٹر سائیکل چلا رہی تھی اور ہاتھی پیچھے سیٹھا تھا۔ راستے میں ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ہاتھی بہت زخمی ہوا، لیکن چیونٹی کو کوئی چوٹ نہیں آئی۔
بتاؤ کیوں؟“

دوسرا بے وقوف سوچتے ہوئے: ”کیوں کہ چیونٹی نے سیلمنٹ پہنا ہوا تھا۔“
مرسلہ: طوبی بنت عبدالرحمن، قریٹی، بلیر
☺ بادشاہ نے اپنے درباری سے کہا: ”رات میں نے خواب میں دیکھا کہ تم گندے پانی میں اور میں شہد میں تسمہ رہا ہوں۔“

مسخرے نے فوراً جواب دیا: ”حضور! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں آپ کو اور آپ مجھے چاٹ رہے ہیں۔“

مرسلہ: نیل احمد محمد علی، جگہ نامعلوم

معلومات افزا

سلیم فرنی

اس بار معلومات افزا کے سلسلے میں صرف ۱۲ سوالات دیے جا رہے ہیں۔ سوالوں کے سامنے نمونہ جوابات بھی لکھے ہیں، جن میں سے کوئی ایک صحیح ہے۔ کم سے کم ۸ صحیح جوابات دینے والے فوہال انعام کے مستحق ہو سکتے ہیں، لیکن انعام کے لیے ۱۲ صحیح جوابات بھیجنے والے فوہالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر ۱۲ صحیح جوابات دینے والے فوہال ۱۵ سے زیادہ ہونے تو پندرہ نام قرعہ اندازی کے ذریعے سے نکالے جائیں گے۔ قرعہ اندازی میں شامل ہونے والے باقی فوہالوں کے صرف نام شائع کیے جائیں گے۔ ۸ سے کم صحیح جوابات دینے والوں کے نام شائع نہیں کیے جائیں گے۔ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ صحیح جوابات دے کر انعام میں ایک اچھی سی کتاب حاصل کریں۔ صرف جوابات (سوالات نہ لکھیں) صاف صاف لکھ کر کوپن کے ساتھ اس طرح بھیجیں کہ ۱۸ اگست ۲۰۱۷ء تک ہمیں مل جائیں۔ کوپن کے علاوہ علاحدہ کاغذ پر بھی اپنا مکمل نام پتہ اردو میں بہت صاف لکھیں۔ ادارہ ہمدرد کے ملازمین کا رکھنا انعام کے حق دار نہیں ہوں گے۔

- ۱ قبل اسلام لڑی جانے والی جنگ ”حرب فجار“ میں حضور اکرمؐ نے..... سال کی عمر میں حصہ لیا تھا۔ (۱۲ - ۱۵ - ۱۸)
- ۲ زہیر بن عوامؓ کے بیٹے عبداللہ بن زہیرؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ کے..... تھے۔ (بیٹے - بھانجے - نواسے)
- ۳ ”خیر بنگال“..... کو کہا جاتا ہے۔ (خواجہ ناظم الدین - حسین شہید سہروردی - مولوی فضل الحق)
- ۴..... کی کھدائی کا آغاز ۳- نومبر ۱۹۶۸ء کو ہوا تھا۔ (تریلا ڈیم - وارسک ڈیم - منگا ڈیم)
- ۵ سلطان شہاب الدین غوری اور پرتوی راج چوہان کے درمیان جب تراوڑی..... میں ہوئی تھی۔ (۱۱۸۷ء - ۱۱۹۱ء - ۱۰۹۶ء)
- ۶ اسکاٹ لینڈ کا قومی کیمل..... ہے۔ (پولو - گولف - اسکیٹنگ)
- ۷ جب پاکستان میں صبح کے چھ بجتے ہیں تو یورپ کے ملک البانیہ میں رات کے..... بجے کا وقت ہوتا ہے۔ (ایک - دو - تین)
- ۸ بولیویا، براعظم..... کا ایک ملک ہے۔ (شمالی امریکا - جنوبی امریکا - آسٹریلیا)
- ۹ جنوب مغربی ایشیا کے ملک آذربائیجان کی کرنسی..... کہلاتی ہے۔ (مات - منات - کیات)
- ۱۰ ”CUSTARD APPLE“ انگریزی زبان میں..... کو کہتے ہیں۔ (آلوچے - شریفے - پکوتے)
- ۱۱ اردو زبان کا ایک محاورہ: ”آٹھوں پر.....“ پانڈھنا۔ (دجی - ڈوری - ہا)
- ۱۲ مولوی اسماعیل مریضی کے اس شعر کا دوسرا مصرع مکمل کیجیے: جب کہ دو موزیوں میں ہو کھٹ پٹ..... اپنے..... کی فکر کر جھٹ پٹ (ٹٹے - بچے - بھانجے)



کوپن برائے معلومات افزا نمبر ۲۶۰ (اگست ۲۰۱۷ء)

نام:

پتا:

کوپن پر صاف صاف نام، پتہ لکھیے اور اپنے جوابات (سوال نہ لکھیں، صرف جواب لکھیں) کے ساتھ لفافے میں ڈال کر دفتر ہمدرد فوہال، ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۷۴۰۰ کے پتے پر اس طرح بھیجیں کہ ۱۸- اگست ۲۰۱۷ء تک ہمیں مل جائیں۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام لکھیں اور صاف لکھیں۔ کوپن کو کٹ کر جوابات کے صفحے پر چسکا دیں۔

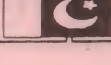
کوپن برائے بلا عنوان انعامی کہانی (اگست ۲۰۱۷ء)

عنوان:

نام:

پتا:

یہ کوپن اس طرح بھیجیں کہ ۱۸- اگست ۲۰۱۷ء تک دفتر پہنچ جائے۔ بعد میں آنے والے کوپن قبول نہیں کیے جائیں گے۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام اور ایک ہی عنوان لکھیں۔ کوپن کو کٹ کر کاپی ساز کے کاغذ پر درمیان میں چسکائیے۔



تاریخی، دینی اور معلوماتی کتابیں

امت کی مائیں

اس کتاب میں ان قابل احترام خواتین کی زندگی کے حالات بیان کیے گئے ہیں جن کو اپنی زندگیوں کا بڑا حصہ حضور ﷺ کے سایہ رحمت میں گزارنے کی یہ سعادت حاصل ہوئی اور امت کی مائیں کہلائیں۔ یہ سعادت ان کو کیسے حاصل ہوئی؟ یہ جاننے کے لیے جناب حسین مٹھی کی یہ کتاب ضرور پڑھیے۔ امت کی ماؤں کی زندگیاں صبر و رضا، ایثار اور ثابت قدمی کے قابل تقلید نمونے ہیں اور خاص طور پر مسلمان بچیوں اور خواتین کے لیے سبق آموز ہیں۔

صفحہ : ۳۰ قیمت : ۴۰ روپے

قرآنی کہانی

حضرت یوسف علیہ السلام

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بعض انبیاء علیہم السلام کے سچے واقعات بیان کیے ہیں، تاکہ ہم ان سے رہنمائی اور سبق حاصل کر سکیں۔ ایسا ہی ایک قصہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے، جو قرآن پاک کے خاص قصوں میں سے ایک ہے اور بہت دل چسپ ہے۔

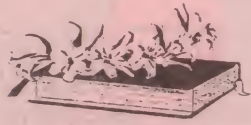
یہ قصہ پروفیسر نصیر احمد چیمہ نے قرآنی کہانی کے طور پر نہایت آسان اور دل چسپ زبان میں بیان کر دیا ہے تاکہ آسانی سے پڑھا جائے۔

خوب صورت رنگین ٹائٹل، صفحات : ۳۲ قیمت : ۳۰ روپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی۔ ۷۴۶۰۰

خوش ذوق نونہالوں کے پسندیدہ اشعار

بیت بازی



جاننا ہوں ایک ایسے شخص کو میں بھی مٹیر
غم سے پتھر ہو گیا، لیکن کبھی رویا نہیں

شاعر : سید غازی پند : محمد سیر نواز، ناظم آباد

میں ایسے شخص کو زندوں میں کیا شمار کروں
جو سوچتا بھی نہیں، خواب دیکھتا بھی نہیں

شاعر : سید زادہ قاسم پند : مانو صدیق، دھیر

میں اپنے دشمنوں سے بھی عداوت نہیں کر سکتا
خود اپنے قاتلوں کو مسکرا کے چھوڑ دیتا ہوں

شاعر : ناصر زیدی پند : محمد علی میر خان، کراچی

کہا ساتھی کوئی دکھ درد کا تیار کرنا ہے
جواب آیا کہ یہ دریا اکیلے پار کرنا ہے

شاعر : عدیم ہاشمی پند : روینہ ناز، کراچی

یہ مجھ میں اتنی بغاوت کہاں سے آئی ہے
جو ایک آن میں ”ہاں“ سے ”نہیں“ پر آ گیا ہوں

شاعر : ظفر اقبال پند : خرم احمد خان، ناٹھ کراچی

پتھروں کے اس مکان کو گھر کیسے کہوں
کوئی تو ہو، جو مکان کو گھر بنانے آئے

شاعر : عمار شفیق پند : احمد رضا عطاری، جگہ نامعلوم

دل میں میرے بھی یقیں اور گماں ساتھ رہے
جیسے انکار تیرے لب پہ ہے اقرار کے ساتھ

شاعر : معین فریدی پند : اہم سجان، کراچی

گیا شیطان مارا، ایک نجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس نجدے میں سر مارا تو کیا مارا

شاعر : ذوق پند : علی حیدر لاشاری، لاہور

محمدؐ رہنمائے انس و جاں ہے
رسولؐ کبریائے دو جہاں ہے

شاعر : گوہد پرشاد فضا پند : ذاکر فرازیہ اقبال، مزید آباد

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
خوجیرت یوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شاعر : علامہ اقبال پند : شاکر ڈیٹان، میر

زندگی کے اداس لمحوں میں
بے وفائے دوست یاد آتے ہیں

شاعر : عبدالحمید عادم پند : آصف یوزدار، میر پور ماحیلو

وہ جس کی روشنی کچے گھروں تک بھی پہنچتی ہے
نہ وہ سورج نکلتا ہے، نہ اپنے دن بدلتے ہیں

شاعر : حبیب جالب پند : عاقب خان جدون، ایبٹ آباد

ضبط غم اس قدر آساں نہیں فراز
آگ ہوتے ہیں وہ آنسو، جو پیے جاتے ہیں

شاعر : احمد فراز پند : سلمان یوسف سمجہ، بلی پور

انسان کے پہلو میں دل ہے کہ پتھر
ہر ظلم کو دیکھ کر جو خاموش رہا ہے

شاعر : قیس شفا پند : ثاقب محمود جموعہ، پنڈ دادن خان

چکن تکہ پیزا (بغیر ادون کے) / مرسلہ : سمیہ وسیم، سکھر

شیرمال : ایک عدد / مرغی کے سینے کا گوشت : ۲۵۰ گرام / پنیر خت : حسب ضرورت
لٹاڑ (درمیانی) : ایک عدد / تکہ سالاد : ایک پیکٹ / پیاز (چھوٹی) : آدمی
شملہ مرچ (بڑی) : آدمی / تیل : دو کھانے کے چمچے / کچپ : تین کھانے کے چمچے
ادرک : چھوٹی سی / لہسن (درمیانی) : ایک جوا / سویا ساس، سرکہ اور چلی ساس : ایک کھانے کا چمچ
ترکیب : سب سے پہلے مرغی کو اُبال کر مونے موٹے ریشے کر لیں۔ آدھا ٹماٹر ادرک، لہسن کا پیسٹ بنا کر مرغی میں شامل کر لیں۔ اس کے بعد تکہ سالاد ایک تہائی پیکٹ اور ایک کھانے کا چمچ سویا ساس، چلی ساس، سرکہ اور ایک کھانے کا چمچ تیل شامل کر کے اچھی طرح بھون لیں۔ ایک چو لھے پر بلیکی آج میں بھگونا گرم کریں اور دوسرے چو لھے پر تو اگرم کریں۔ ایک بڑی پلیٹ پر تیل لگا کر اس پر شیرمال رکھ دیں۔ اس پر پہلے کچپ کی تہ اور پھر چکن کی تہ لگائیں۔ آدھا ٹماٹر، آدھی پیاز اور آدھی شملہ مرچ چوکور کٹی ہوئی اس پر پھیلا دیں، پھر پیچہ کو کدو کش کر کے اس پر پھیلا دیں اور پلیٹ کو تو سے پر رکھ دیں اور گرم کیا ہوا بھگونا پلیٹ پر اُٹا کر کے ڈھک دیں اور بلیکی آج پر پندرہ منٹ تک سینک لیں، پھر اس میں چھری کی مدد سے دیکھیں کہ روٹی چپک تو نہیں رہی، اگر نہ چپکے تو سمجھ لیں تیار ہے۔ مزے دار چکن تکہ پیزا کچپ سے تناول فرمائیں۔

کیک / مرسلہ : سیدہ ہاجرہ ریحان، اسلام آباد

میدہ : ایک کپ / چینی : ایک کپ / دودھ : آدھا کپ / انڈا : ایک عدد
بیکنگ سوڈا : ایک چوتھائی چائے کا چمچ / بیکنگ پاؤڈر : آدھا چائے کا چمچ
نمک : ایک چمچ / تیل : آدھا کپ

ترکیب : چینی، بیکنگ پاؤڈر، سوڈا اور نمک پیس کر تین مرتبہ چھان لیں۔ انڈے کو اچھی طرح پھینٹیں۔ پھر اس میں تیل ڈال کر پھینٹیں۔ آخر میں دودھ ڈال کر پھینٹیں۔ پھر اس میں چھنی ہوئی خشک چیزیں ملا لیں۔ ادون کو گرم کر لیں۔ یہ آمیزہ برتن میں ڈال کر ادون میں رکھ دیں۔ آدھے گھنٹے میں مزے دار کیک تیار ہو جائے گا۔ ☆

ماہ نامہ ہمدرد نو بہال اگست ۲۰۱۷ء ص ۸۸



فرح عمیر، کراچی



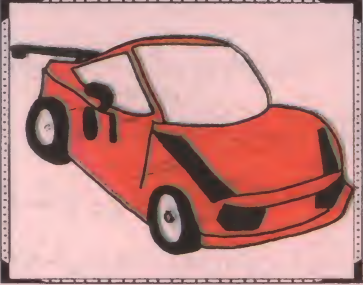
نو بہال مصور



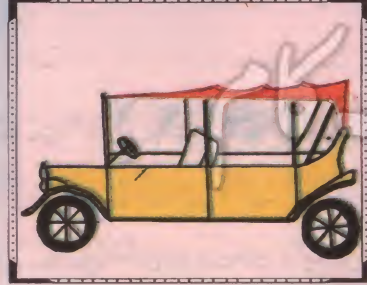
محمد حفیظہ جمال، طارق روڈ



اُم ایمن، چشمہ، میانوالی



محمد اسد سمیع، ڈیرہ غازی خان



حظہ احمد صدیقی، کورنگی

الباطروس

ظفر شمیم



یہ خوب صورت آبی پرندے الباطروس (ALBATROSS) ہیں۔

یہ لمبے بازوؤں والا بحری پرندہ ہے۔ یہ بطریل کا ہم نسل ہے، جو بحر الکاہل اور بحر جنوبی کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔

ایک دن میں ۵۰۰ میل تک اڑنا ان کے لیے معمولی سی بات ہے۔ اس ریکارڈ کے بل بوتے پر یہ پرندوں کے شہنشاہ شاہین سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ ایک گھنٹے میں ۷۰ سے ۸۰ میل اڑنا اور برفانی دنیا پر راج کرنا ان کے لیے معمولی سی بات ہے۔ مچھلیاں اور دیگر سمندری جانور ان کی من پسند خوراک ہے۔ الباطروس کو قادوس بھی کہتے ہیں۔ ☆



مسکراتی

لیکھیں

ایک دوست: ”گرمی کا ایک فائدہ تو ہے۔“

دوسرا دوست: ”وہ کیا ہے؟“

پہلا دوست: ”سردی نہیں لگتی۔“

لطیفہ: عبدالرافع، لیاقت آباد